نومبر سنہ ۱۹۶۰ء

نگار

سالانہ چندہ (علاوہ مصارف رجسٹری سال نامہ)

ہندوستان	پاکستان
دس روپے	

قیمت فی کاپی

ہندوستان	پاکستان
۷۵ نئے پیسے	۱۲/

تصانیف نیاز فتحپوری

من و یزداں - ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتح پوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک عبقری کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور بانی کی تحقیق دینی عقائد و رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی تاریخ پر تاریخی و علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپئے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے اس کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) ہاروت و ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۶۲ کاغذ و سیزدہ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے صرف (علاوہ محصول)

جمالستان ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ، ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے صرف (علاوہ محصول)

نگارستان حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے ہیں اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مکتوبات نیاز (تین حصوں میں) ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپے (علاوہ محصول)

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

شہاب کی سرگذشت حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشائے عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے (۱۶/) (علاوہ محصول)

آیندہ سالنامہ
"غالب نمبر" ہوگا

لیکن بالکل نئے زاویہ سے، بالکل نئے رُخ سے

غالب پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ غالب پر کتابیں، بھی شایع ہوئی ہیں، تنقیدی مقالے بھی لکھے گئے ہیں محض رسایل و جرایدنے بھی خصوصی نمبر شایع کئے ہیں لیکن ان سب میں صرف دو باتوں کو پیش کیا گیا ہے ایک اس کے سوانح حیات ر دوسرے اس کی اُردو شاعری کا فلسفیانہ و متصوفانہ پہلو۔ حالانکہ صحیح غالب نام نہ اس کے سوانح کا ہے اور نہ اسکی حکمیاتی شاعری کا۔ بلکہ وہ سانس لیتا ہے دراصل اپنے اس جارحانہ کلام میں جس کا تعلق صرف شوخی، بیباکی، طنز و ظرافت و جرائت رندانہ سے ہے۔

اس کا احساسِ خودی، اس کی "گل افشانیٔ گفتار" اس کے "نقشہائے رنگ رنگ"، اس کے طنزیہ اشارے، اسکے ظریفانہ کنائے، اس کی حریفانہ چوٹیں اور سب سے زیادہ اس کا رندانہ لب و لہجہ۔ غالب کی یہ وہ خصوصیات ہیں جن کو وہ اپنی زبان میں

مرا کردہ اند آشکارا بہ من

کہتا ہے اور یہ اب تک بہت کم سامنے آئی ہیں ــ "نگار" کا یہ "غالب نمبر"۔ غالب کے اسی مصرع کی تفسیر ہوگا۔

اس نمبر میں آپ کو یقیناً یہ کچھ نہ ملے گا کہ غالب کا خاندان کیا تھا، وہ کہاں پیدا ہوا، دہلی میں اس پر کیا کیا گزری، وہ کہاں کہاں گیا، کن کن تلخ تجربات سے اسے واسطہ پڑا۔ یہ گورکھنی بہت کچھ ہو چکی ہے۔

اس نمبر میں آپ کو "زندہ غالب" ملے گا "پرافگندہ نقاب"۔ عریاں، بے باک اور کسی سے نہ ڈرنے والا ایک ایسا شاعر جس کی دوسری مثال اُردو، فارسی میں کہیں نظر نہیں آتی۔

یہ نمبر اُردو غالب اور فارسی غالب دونوں کا امتزاج ہوگا

اس التزام کے ساتھ کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اسے ہر شخص آسانی سے سمجھ سکے۔ اس میں غالب کے فارسی اور اُردو کلام کا ایسا جنچا تلا انتخاب بھی درج ہوگا جو آپ کو اس کے اُردو و فارسی دواوین کی طرف سے بے نیاز کر دے گا۔

نیاز

دوست بنانے
اور
دوستی بڑھانے کے لیے
ہمیشہ استعمال کیجیے

گولڈ کوائن
اصلی
ایپل جوس
صاف و شفاف

بنانے والے

ڈائرمیکن بروریز لمیٹڈ

قائم شدہ ۱۸۵۵ء لکھنؤ

فیکٹریز :- سولن بروری - لکھنؤ ڈسٹلری - کسولی ڈسٹلری
موہن نگر بروری اینڈ الائیڈ انڈسٹریز (یوپی)

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے **نگار** اس امر کی کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

۳۹ واں سال | فہرست مضامین نومبر ۱۹۶۰ء | شمارہ ۱۱

ملاحظات ..... اڈیٹر ۳
مصحفی کی انفرادیت اور شخصیت ... ایک پروفیسر ... ۶
جگر و کلام جگر ..... قیسی الفاروقی ... ۱۶
عصر جدید کے فلاسفہ ... نواب محمد عباس طالب صفوی ۲۲
قرۃ العین ..... پروفیسر عصمت اللہ جاوید ... ۲۶
باب الاستفسار ..... نیاز فتحپوری ... ۳۵
چند لمحے غالب کے ساتھ ... نیاز فتحپوری ۴۱
شعر منثور ..... نیاز فتحپوری ۴۷
شذرات ..... نیاز فتحپوری ۴۸
منظومات ..... مسعود اختر جمال - شہاب سرمدی
شفقت کاظمی ۵۰
مطبوعات موصولہ ۵۳

ملاحظات

اُردو کی خدمت کا بہترین موقع

مردم شماری اب کی بار ۱۰ فروری ۱۹۶۱ء سے شروع ہوگی اور ۲۸ فروری کو غروب آفتاب کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔

اُردو سے محبت رکھنے والوں کا فرض ہے کہ ریاست کے گوشہ گوشہ میں مردم شماری کے وقت زبان کا اندراج غلط نہ ہونے دیں۔ مردم شماری بہت بڑا کام ہے، سرکار کو ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ ہر حلقہ کے صحیح اعداد و شمار معلوم ہو جائیں، اس لئے ضروری ہے کہ ہر شہر، قصبہ اور گاؤں میں مردم شماری کمیٹی بنائی جائے۔

(۱) مردم شماری کے رجسٹر میں خانہ نمبر ۶ و ۷ میں جو مادری زبان اور ثانوی زبان کے اندراج کے خانے ہیں ان میں مادری اور ثانوی زبان کا اندراج بغیر کسی ڈر یا خوف یا لالچ کے کرانا چاہئے ۔۔۔ ہم سب کو یہ پیغام گھر گھر پہونچانا ہے اور عوام کو بتانا ہے کہ مردم شماری کے اندراج کے بعد وہ رجسٹر بھی دیکھ لیں کہ انھوں نے جو باتیں بتائی ہیں اُن کا اندراج ٹھیک ہوا ہے یا نہیں۔

(۲) حکومت مردم شماری کے لئے ڈسٹرکٹ بورڈ، میونسپل بورڈ اور دوسرے محکموں سے ملازمین کی خدمات مستعار لیتی ہے اور اس کے علاوہ بھی مدد کے لئے ہزاروں آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کمیٹی کا فرض ہے کہ وہ اپنے حلقہ کے حکام سے مل کر اپنی کمیٹی کے سمجھ دار ممبران کی خدمات زیادہ سے زیادہ رضاکارانہ طریقہ پر پیش کرے اور پھر وہ حضرات پوری دیانتداری کے ساتھ

مردم شماری اور خصوصاً زبان کے متعلق صحیح معلومات بہم پہونچانے کی کوشش کریں۔

(۳) مردم شماری کمیٹی کے ممبران ہر حلقہ میں مردم شماری کے وقت موجود رہیں، اگر کسی گھر کے اندراج صحیح نہ کئے گئے ہوں اور وہاں کے لوگ شاکی ہوں تو ان کی شکایت فوراً مردم شماری کرنے والوں تک پہونچائی جائے۔ تاکہ اندراج اسی وقت ٹھیک کرلئے جائیں اگر وہ لوگ نہ سنیں تو فوراً گھر کا میونسپل اور مردم شماری نمبر لکھ کر گھر والوں کی طرف سے مقامی افسر کلکٹر کو اطلاع دیجائے تاکہ مردم شماری کے دوسرے دور میں ان غلطیوں کا ازالہ کیا جاسکے۔

جمہوری اور آزاد ہندوستان میں اس مردم شماری کی بہت اہمیت ہے جس ضلع میں ایک یا دو زبانوں کے جاننے والے زیادہ ہوں گے وہاں انھیں زبانوں میں سرکاری سرکلر شایع ہوں گے انھیں زبانوں کا اسکولوں میں پڑھانے کا انتظام کیا جائے گا، عدالتوں میں اسی زبان میں کارروائی کی جایا کرے گی۔

اس لئے مردم شماری کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنی مصروفیت کے باوجود تھوڑا سا وقت نکال کر صحیح اندراج کرنے میں مدد دے۔

یاد رکھئے کہ اگر آپ اپنے گھروں میں اُردو بولتے ہیں اور کاروبار میں بھی اُردو بولتے اور سمجھتے ہیں تو اپنی مادری زبان اُردو لکھوایئے، ہندوستانی درج نہ کرایئے یہ بڑی سخت غلطی ہوگی۔ اُردو زبان سے مراد شاعروں اور ادیبوں کی کتابی زبان نہیں ہے بلکہ روزمرہ کی وہ زبان مراد ہے جسے آپ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ لب و لہجہ کے فرق یا لفظوں کی تھوڑی سی تبدیلی سے زبان نہیں بدلتی۔ اس لئے اگر کسی صوبہ کے مختلف حصوں میں میں لب و لہجہ کا فرق پایا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ زبان بدل گئی۔

بہرحال مردم شماری اُردو زبان کی خدمت کا بڑا اہم موقع ہے اور اگر آپ کی مادری زبان اُردو ہے یا مادری زبان ہی کی طرح عزیز ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اسے بھول جائیں۔ یہ سوال مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور ہندو، مسلمان سکھ، عیسائی ہر ایک کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی مادری و ثانوی زبان جو چاہے درج کرائے جبر یا دباؤ سے اسے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ حکومت خود بھی یہی چاہتی ہے کہ مردم شماری کے تمام اندراجات بالکل صحیح ہوں۔

نیا ادبی لٹریچر

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ... سید احتشام حسین ... ۱۲ر
ساحل اور سمندر (سفرنامہ) ... " " ... للعہ ۸ر
چھان بین۔ تنقیدی مقالات ... اثر لکھنوی ... ۳ر ۸ر
اُردو میں رومانوی تحریک ... ڈاکٹر محمد حسن ... ۱ر ۸ر
آتشِ گل ... جگر مراد آبادی ... ۳ر
ناول کی تاریخ اور تنقید ... علی عباس حسینی ... ۳ر
تنقیدی شعور ... سید اختر علی تلہری ... ۱۲ر
فسانۂ عبرت۔ مصنفہ رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب ۱۲ر
فرہنگ امثال ... " " ... ۱۲ر
بیگمات اودھ ... تصدق حسین ... ۳ر

اُردو تنقید پر ایک نظر ... پروفیسر کلیم الدین احمد ... ۵ر
نقش حالی۔ حصہ اول ... ۵ر
نقش حالی۔ حصہ دوم ... ۳ر
نقوش افکار ... مجنوں گورکھپوری ... ۳ر ۸ر
ذوق ادب و شعور ... احتشام حسین ... ۳ر ۸ر
روایت اور بغاوت ... " ... للعہ ۸ر
تنقیدی جایزے ... " ... ۳ر ۸ر
تنقیدی نظریات ... " ... ۵ر
ادب و نظر ... آل احمد سرور ... للعہ ۸ر
ادبی تنقید ... ڈاکٹر محمد حسن ... للعہ ۸ر

یقینِ کامل

یقینِ کامل سے دل میں جلتی ہے شمع وہ جذبۂ عمل کی
جو پَو پھٹے بھیجتی ہے محنت کشوں کو میدانِ زندگی میں!
اُمڈتے دریا، بپھرتے طوفاں، یہ سرکش و سنگدل کہستاں
بچا ہے انساں نے زیر اِن کو، یقینِ کامل کی بیخودی میں!

یقینِ کامل ہی ہے وہ قاصد جو دل کو پیغام دے رہا ہے،
کہ دُور جو آج ہیں وہ خوشیاں نہ ہونگی کل اِتنی دُور ہم سے
ایک ایسی محنت سے آج انسان اپنی ناؤ کو کھے رہا ہے،
کہ کل سحر تک تو ہم بہت دُور جا چکے ہونگے شہرِ غم سے!

آج بھی، پہلے کی طرح، ہماری مصنوعات آپ کے گھروں کو زیادہ صاف، زیادہ تندرست اور زیادہ مطمئن بنانے میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ لیکن آج ہم...
کل کے لئے کام کر رہے ہیں، جب زیادہ آرامدہ زندگی کے لئے آپ کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور زیادہ سہولتوں کی طلبگار ہوں گی۔ اور ہم زیادہ وسیع زرائع، نئی ایجادوں اور نئی مصنوعات سے اُس وقت بھی آپ کی خدمت کے لئے تیار پائے جائیں گے!

آج اور ہمیشہ ... ہندوستان لیور کا آدرش — بہتر گھر کی خدمت

PR. 6-X 52 UD

مصحفی کی انفرادیت اور شخصیت

(ایک پروفیسر)

صاحب طرز ادیب و شاعر اُردو کیا دوسری زبانوں میں بھی کم ہوئے ہیں۔ صاحب طرز ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط انفرادیت ہے۔ ڈیلٹن مرے نے طرز کی تعریف یوں کی ہے :-

"Style is that personal idiosyncrasy of expression by which we recognise a writer."

"وہ انفرادی خصوصیت جو مصنف کی ذاتی چھاپ رکھتی ہو، طرز کہلاتی ہے"۔ بعض میں یہ چھاپ بہت نمایاں ہوتی ہے بعض میں کم۔ مصحفی بھی ان ہی شاعروں میں سے ہیں جن کی انفرادیت اتنی نمایاں نہیں، کیونکہ مصحفی کی شخصیت میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ فوراً پہچان لئے جائیں۔

مصحفی، متین، سنجیدہ، ملنسار تھے۔ ان کی طبیعت میں سوز و گداز بھی تھا، لیکن یہ سوز و گداز اس حد تک نہیں تھا کہ وہ قنوطیت سے جا ملے۔ مصحفی کے یہاں ایک حد تک رجائیت بھی ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں جو تنوع ہے اس کی وجہ ان کا "نشاط آمیز وجدان" ہے، لیکن اس کے باوجود مصحفی ہنسوڑ یا ٹھٹھول باز نہیں کہے جا سکتے۔ وہ زندگی بھر ناموافق حالات سے نباہ کرتے رہے۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے تذکروں میں جا بجا کیا ہے۔ اسی چیز نے ان کو غیر نمایاں رکھا۔ ناموافق حالات میں شخصیت یا تو بے حد اُبھر آتی ہے۔ یا پھر بہت دب جاتی ہے۔ لیکن جس طرح ہر انسان میں چند ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے جیسے لاکھوں انسانوں سے ممیز ہو جاتا ہے، اسی طرح ہر اچھے اور بڑے شاعر میں بھی اس کی اپنی انفرادی شخصیت لازمی طور پر ظاہر ہوتی ہے اور وہ اسی کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ مصحفی کی اس غزل میں ان کی انفرادیت پوری طرح نمایاں ہے :-

دیکھ اس کو اک آہ ہم نے کر لی — حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی
جب اس نے چلائی تیغ ہم پر — آنکھوں کی پناہ ہم نے کر لی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا — کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی
کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے — اس شوخ سے راہ ہم نے کر لی
دی ضبط میں جبکہ مصحفی جان — شرم اس کی گواہ ہم نے کر لی

اس غزل سے متعلق فراق صاحب کا کہنا ہے :- "بظاہر اس غزل میں میر کی تقلید معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقتاً اس میں میر کی دلشکستگی، درد کی کم سخن سنجیدگی اور سودا کی سادگی سب شامل ہیں"۔ ان سب چیزوں کی شمولیت اس وجہ سے نہیں ہے کہ مصحفی بیک وقت ان تمام شاعروں کی تقلید کرنا چاہتے تھے اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے، جیسا کہ حسرت موہانی صاحب نے بھی لکھا ہے :- "جن غزلوں اور بیتوں میں تمام اساتذہ کی خوبیوں کو ان کی بہ مشقی اور استادی یکجا کر دیتی ہے تو ان کا کلام لاریب اُردو شاعری کے

نمونوں میں پیش کیا جا سکتا ہے:۔

مصحفی کی تقلیدی صلاحیت یا ان کی کہنہ مشقی اور استادی اساتذہ کی خوبیوں کو یکجا نہیں کر دیتی تھی بلکہ ان کی شخصیت کے خمیر میں یہ تمام عناصر داخل تھے اور بہت توازن کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرز میں بڑی سیماب وشی آگئی ہے۔ تاہم ان کی انفرادیت سان لینا کچھ ایسا مشکل نہیں۔

ان کی شخصیت کے متعدد پہلو ہوتے ہیں، جن میں سے بعض بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ مصحفی کی شخصیت میں ہمیں کوئی ایسا نمایاں پہلو نہیں ملتا۔ ان کی شخصیت میں نہ تو میر کا سا سوز و گداز و استغنا ہے اور نہ سودا کا سا طنطنہ اور دبدبہ، درد کی طرح وہ صوفی منش بھی نہیں اور۔ سوز کی طرح سادہ و یکرنگ۔ وہ نہ انشا کی طرح ظریف اور چٹکلے باز اور نہ جرأت کی طرح حسن و عشق کے ظاہری معاملات کے رسیا، لیکن اس کے باوجود ہم کو مصحفی کے ہاں یہ تمام باتیں مل جاتی ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟۔ بات یہ ہے کہ یہ تمام باتیں انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ میر، سودا، انشا وغیرہ کے ہاں ان کی شخصیت کا کوئی خاص پہلو اتنا ابھر گیا کہ وہ اس کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے لیکن مصحفی کے یہاں یہ تمام پہلو بڑے توازن کے ساتھ نظر آتے ہیں، جس کا تذکرہ ذیل کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے:۔

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا — ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
جس کو ہم روز ہجر سمجھے تھے — ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

پیار تو آیا تھا میرے جی میں رات — پر میں تیری وضع سے ڈر کر گیا

کبھو نک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے — ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے،

حادثے ہوتے تھے زمانے میں — اس قدر انقلاب کس دن تھا
مصحفی آج تو قیامت ہے — دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

مصحفی عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا — آدمی جاتا ہے اس راہ میں اکثر مارا

ملو ہو غیروں سے اور ہم سے بیوفائی ہے — یہ کون شیوہ ہے کیا رسم آشنائی ہے

اے مصحفی افسوس کہاں تھا تو دوانے — کل اس کے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا

جب کوہ و بیاباں میں جا ہم نے قدم مارا — فرہاد نہ کچھ بولا مجنوں نے نہ دم مارا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم، — تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

کبھی جو یوں بھی ملو تم تو مہربانی ہے — غرض وہ وصل کا وعدہ تو درکنار رہا

یا وہ عالم تھا کہ کوئی اس سے واقف بھی نہ تھا — یا یہ عالم ہے کہ عالم اس پہ مرجانے لگا

اٹھنے لگے جو وہ مری بالیں سے وقت نزاع — نکلا یہی زباں سے آہستہ کیا چلے،

جو پھرا کے منہ کو اس نے بقضا نقاب الٹا — ادھر آسمان الٹا ادھر آفتاب الٹا

بسوال بوسہ اس نے مجھے رک کے دی جو گالی — میں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب الٹا

چھپایا تم نے منہ ایسا کہ بس جی ہی جلا ڈالا، — تغافل نے تمہارے خاک میں ہم کو ملا ڈالا

کہے تو کھیل لڑکوں کا ہے یہ یعنی مصور نے — جو نقش اس صفحہ ہستی پہ کھینچا سو مٹا ڈالا

زلفوں کی برہمی نے برہم جہان مارا — پلکوں کی کاوشوں نے سینوں کا چھان مارا

ہرگز وہ دست و بازو ہلتے کبھی نہ دیکھے — جو تیر اس نے مارا سو بے گمان مارا

قدم اس دھج سے کچھ پڑتا ہے اس غارتگر جاں کا — کہ دل ہر ہر قدم پر لوٹتا ہے گبر و مسلماں کا

اول تو یہ دھج اور یہ رفتار غضب ہے ۔۔۔ تس پر ترے پازیب کی جھنکار غضب ہے
دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر ۔۔۔ شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر
جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے ۔۔۔ ہم نے بھی اپنے دل میں کیا خیال باندھے
دل سے خبر نہیں ہے مجھے اس کے مصحفی ۔۔۔ آنکھوں میں تو اشارہ کئی بار ہو گیا،
انگڑائی لے کر اپنا مجھ پر خمار ڈالا ۔۔۔ کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا
ساتھ سونا اس کا یاد آیا جو مجھ کو مصحفی ۔۔۔ رات میں بستر پہ کیسا تلملا کے رہ گیا

ان اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصحفی کے ہاں داخلیت اور خارجیت کا بڑا متوازن امتزاج پایا جاتا ہے۔ مصحفی کی شاعری لکھنؤ اور دہلی کی بہترین شعری روایات کا امتزاج ہے۔ لیکن یہ محض ان کی "قوتِ آخذہ" یا "تقلید اور انتخابیت" کا نتیجہ نہیں ۔۔۔ ورنہ انشا کے مقابلہ میں ان کو زک نہ اٹھانی پڑتی یا پھر میر کا درجہ مصحفی سے اونچا نہ ہوتا۔

مصحفی کی شاعری میں جو داخلیت اور خارجیت کے حسین عناصر ملتے ہیں اور ان کے ہاں داخلیت کا جو غلبہ ہے یا ان کے یہاں خارجیت بھی جو داخلی ہو جاتی ہے، سو ان سب کی وضاحت بغیر ان کی شخصیت کو سمجھنا ممکن نہیں۔ شخصیت کی تعمیر میں زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، مذہبی اور پھر ادبی اور علمی اثرات کو بڑا دخل ہے اور مصحفی کی شخصیت کا تجزیہ کرنے کے لئے ان مخصوص حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

مصحفی کے آباؤ اجداد امروہے کے باشندے تھے، وہ شاہی ملازم تھے اور متمول تھے، لیکن زمانہ کے انقلاب نے مصحفی کو فراغت نصیب نہ ہونے دی، امروہہ چھوڑنا پڑا اور دہلی میں قسمت آزمائی کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مصحفی کا شعور پختہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی لوہا گرم تھا اور اتنی نرمی تھی کہ حادثات کے ہتھوڑوں بے بکار اور فرسودہ حصوں کو نکال دیا اور اسے ایک خاص شکل دینی شروع کر دی۔ یہ مصحفی کی زندگی کا سب سے اہم دور تھا اور یہی دہلی کا بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ احمد شاہ اور نادر شاہ کے حملوں نے دہلی کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ انگریز اپنا تسلط جما رہے تھے، جس کا اظہار مصحفی نے بھی کیا ہے:۔

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی ۔۔۔ کافر فرنگیوں نے یہ تدبیر کھینچ لی

اور ایک ہی جگہ سکون تھا سے

بس قلعے کے نیچے ہی تک اک آرام ہے

لیکن وہ بھی سکون کا ایک دھوکا تھا۔ شاہ عالم قطعی طور پر مفلوج ہو چکے تھے اور ان کی حکومت "دلی تا پالم" رہ گئی تھی۔ ادھر مقامی طاقتیں الگ سر اٹھا رہی تھیں اور ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو کر ملک کو کمزور سے کمزور تر کر رہی تھیں۔ ان حالات نے ساری فضا میں یاس اور حرماں نصیبی کی لہر دوڑا دی تھی۔ ہر شخص اپنا مستقبل غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ پرانی اقدار ختم ہو رہی تھی اور نئی قدریں ان کی جگہ لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان حالات نے مصحفی کو بھی متاثر کیا۔ مجنوں گورکھپوری نے اس دور کے شاعروں کے متعلق یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔ "غم دوستی اور یاس پرستی ہر چھوٹے بڑے شاعر کے ضمیر میں داخل تھی اور ان کے کلام کی اصل روح تھی"۔ اسی "غم دوستی" اور "یاس پرستی" نے مصحفی کی شخصیت میں سوز و گداز پیدا کر دیا تھا اور اسی بنا پر وہ شاعری کے لئے درویشی کو ضروری سمجھنے لگے تھے۔ ان کا مقولہ ہے:۔ "والحق کہ درویشی و شاعری دوش بدوش راہ می روند"۔

ان ہی اسباب کی بنا پر ہم کو میر اور مصحفی کی شاعری میں ایک ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود دونوں کی شخصیتوں میں جو نمایاں فرق ہے وہ ان کی شاعری میں بھی پوری طرح عیاں ہے۔ میر کے یہاں جذبے کی آنچ اتنی شدید ہے

کہ الفاظ اپنی اصلیت کو کھو کر جذبہ کے موافق اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں اس کے برخلاف مصحفی کے پاس الفاظ کے سانچے میں جذبات ڈھلتے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصحفی کی شاعری پر کبھی کبھی رجائیت کی چھوٹ پڑتی بھی نظر آتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مصحفی کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات سامنے آئے ہوں جس سے ان پر یہ ثابت ہوگیا ہو کہ زندگی میں صرف رونے دھونے سے کام نہیں چلتا کیونکہ اپنے غم میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا۔

مسکراتا ہے ادھر غنچہ ادھر ہنستا ہے گل　　اس چمن میں گریۂ ابر بہاری ہے عبث

یا پھر ہوسکتا ہے کہ وہی حالات جنھوں نے میر کو بڑی حد تک قنوطی بنا دیا تھا مصحفی کو ایک حد تک رجائی بنا دیا ہو کیونکہ ایک ہی واقعہ سے دو مختلف آدمی مختلف اثر قبول کرتے ہیں ؎

جو سیر کرنی ہے کرلے کہ جب خزاں آئی　　نہ گل رہے گا چمن میں نہ خار ٹھیرے گا

یہاں ایک قنوطی احساس نے ایک رجائی احساس پیدا کیا ہے۔ خزاں کا احساس منفی پہلو اختیار کر رہا ہے لیکن وقت سے فایدہ اٹھا لینے کی تلقین مثبت پہلو کی غمازی کرتی ہے۔ مصحفی ساری عمر مخالف حالات سے مفاہمت کرتے رہے اور سکون اور آسودگی کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ مندرجۂ بالا شعر میں مصحفی کی اسی شخصیت کا اظہار ہے اور ایسے ہی اشعار میں مصحفی کی انفرادیت نمایاں ہوجاتی ہے مصحفی کی طبیعت میں دردمندی اور سوز کا عنصر غالب تھا اسی وجہ سے ان کی شاعری کی مجموعی فضا میں سوز و گداز اور حسرت و ناکامی کا عنصر زیادہ ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ان کی یہ غزل ہے ؎

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے،　　آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے
حیراں ہے کس کا جو سمندر　　مدت سے رکا ہوا کھڑا ہے
ہے موسم گل چمن میں، ہر نخل　　پھولوں سے لدا ہوا کھڑا ہے
شمشاد برابر اس کے قد کے　　دہشت سے بچا ہوا کھڑا ہے
خونیں کفن شہید الفت　　دولھا سا بنا ہوا کھڑا ہے
اے جان نکل کہ مصحفی کا　　اسباب لدا ہوا کھڑا ہے

اس غزل کا مجموعی تاثر حسرت و غمناکی کو لئے ہوئے ہے لیکن زیادہ شدید نہیں ہے۔ تیسرے اور چوتھے شعر میں مصحفی کی شخصیت انھیں تمام دہلوی شعرا سے ممتاز کر دیتی ہے۔ مصحفی میں "ذوق تماشا" کی کمی نہیں تھی اسی سبب سے وہ "جلوۂ گل" ہو یا "داغ لالۂ صحرائی" دونوں کا نظارہ کرتے ہیں ان کی آنکھ ہر رنگ میں وارفتگی ہے۔ اسی چیز کو دیکھ کر فراق گورکھپوری نے کہا ہے کہ :-
"رنگ روپ، صورت و شکل، سجاوٹ اور نکھار کا آئینہ دار جتنا مصحفی کا کلام ہے اتنا اردو کے کسی اور غزل گو کا کلام نہیں"

مصحفی کے کردار اور ان کے شعری مزاج نے دہلی میں آکر پختگی اختیار کرلی تھی، افسوس ہے کہ مصحفی کا دہلی میں لکھا ہوا دیوان چوری گیا ورنہ طبیعت کے ان میلانات کا پتہ چلانا دشوار نہ ہوتا جنھوں نے آگے چل کر لکھنوی شاعری کی خصوصیات کو قبول کیا۔ مصحفی کے شاعرانہ مزاج کی تشکیل میں دہلی کے ادبی ماحول کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ حکومت کے ختم ہوتے ہوئے اثر و اقتدار کے ساتھ فارسی کا بھی دور دورہ ختم ہو رہا تھا۔ اردو قبولیت عام کا تاج پہنے سارے ہندوستان پر ان کا تسلط جما چکی تھی اس نے بھی شعر و ادب کی معرکہ آرائیوں کے لئے دہلی کو اپنا مرکز بنایا۔ اب دہلی والے شہنشاہی نہیں بلکہ خدائی کرنے لگے تھے کیونکہ انھیں خدائے سخن کی سرپرستی حاصل تھی۔ مصحفی اسی زمانہ میں دہلی آئے اور یہاں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ مصحفی کی حاتم سے لے کر فقیر دہلوی تک ذاتی ملاقات تھی۔ وہ میر اور سودا کی صحبت سے فیضیاب ہوئے تھے، مظہر جانجاں کی آستاں بوسی بھی حاصل تھی، درد کی دردمندیوں سے بھی واقف تھے، اثر کی صحبت سے بھی متاثر ہو چکے تھے۔ پھر ان میں اضافہ کیجئے اُن

بے شمار ادبی محفلوں کا جہاں سارے کے سارے اساتذہ جمع ہوتے تھے۔

دہلی میں مصحفی کے شاعرانہ مزاج کی نہ صرف تشکیل ہی ہوئی بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس نے پختگی بھی یہیں پائی۔ مصحفی کا اپنے دور کے بڑے شاعروں سے متاثر ہونا بالکل قدرتی بات تھی لیکن یہ کہنا کہ مصحفی خود تو غائب ہو گئے، صرف اثر ہی اثر رہ گیا' صحیح نہیں۔ مصحفی اپنا ایک علٰحدہ مزاج اور شخصیت رکھتے ہیں اور وہی چیزیں قبول کرتے ہیں جو ان کی شخصیت سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ مصحفی کے پاس سوز و گداز تھا، لیکن میر کی سی نازک دماغی نہیں تھی۔ وہ ہر شخص سے ملتے اور ہر دربار میں جاتے اور اس وقت جاتے تھے جب تک توقیر ہوتی رہتی تھی۔ میر کے برخلاف کھلے دل سے دوسروں کی اچھائیوں کی تعریف کرتے ہیں جس کے شاہد ان کے تذکرے ہیں۔ سودا کی طرح مصحفی کی طبیعت میں جبروت ہے نہ غصہ لیکن سودا کا سا "نشاط آمیز وجدان" ضرور رکھتے ہیں' اور ساتھ ہی خواہ مخواہ جب کوئی چھیڑ دیتا ہے تو وہ برس پڑتے ہیں۔ مصحفی کو تصوف اور مذہب سے بھی کافی دلچسپی ہے لیکن ان کی طبیعت کو خانقاہیت سے کوئی واسطہ نہیں' وہ دہلی کے شاعروں کے برخلاف عیش و عشرت کے خواہاں رہتے ہیں اور اسکے میسر نہ آنے پر دل گرفتہ بھی رہتے ہیں اور اسے یاد کر کے افسوس بھی کرتے ہیں ؎

عیش کہاں' کدھر نشاط' کہتے ہیں کس کو انبساط
خواب و خیال ہو گیا ہم کو تو عیش اور نشاط

مصحفی کی سنجیدگی اور متانت میں کوئی شبہ نہیں۔ یہی بات تھی کہ میر حسن اپنے بیٹے میر خلیق کو ان کی شاگردی میں دینے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سوز کی طرح مقطع نہیں ہیں۔

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر اگر مصحفی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے یہاں ایک نیا اور مخصوص آہنگ ملے گا اور وہ اپنے اسی منفرد آہنگ سے بآسانی پہچانے جا سکتے ہیں ؎

مصحفی عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا ــــ آدمی جائے ہے اس راہ میں اکثر مارا
مصحفی عشق کر کے آخر کار ــــ خوب رسوا ہوئے جہاں میں ہم
جس کو ہم روز ہجر سمجھے تھے ــــ ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا
ہم سمجھے تھے جس کو مصحفی یار ــــ وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا
جب واقف راہ و روش ناز ہوئے تم ــــ عالم کے میاں خانہ برانداز ہوئے تم
خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا ــــ ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا ــــ کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا
داغ دیکھے تھا کھڑا لالہ صحرائی کا ــــ اور عالم نظر آیا ترے سودائی کا
تیرے ہوتے جو مجھے یاد بھی آیا کوئی کام، ــــ میں نے موقوف اسے وقت دگر پر رکھا
جی دینے میں صرفہ نہ کیا ہم نے کسی سے ــــ ہر چند کہ اس بات میں اپنا ہی زیاں تھا
اے کہ رونے پہ مرے تجھ کو ہنسی آتی ہے ــــ نہیں آیا تو کبھی عشق کی آفات میں کیا
ساقی شراب لایا مطرب رباب لایا ــــ مجھ پر تو ایک قیامت عہدِ شباب لایا
کٹتی نہیں ہے رات بے کسی کی ــــ کیا جانے کوئی کسی کے جی کی
اے مصحفی بہار کے دن ہیں یہ بے نصیب ــــ چل تو بھی باغ میں گل و شبنم کی سیر کر
یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا، ــــ ہر چند کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں،

اے مصحفی شانیں ہیں مری جلوہ گری میں ہر رنگ میں، میں مظہرِ آثارِ خدا ہوں

مصحفی کی عمر کا بڑا حصّہ لکھنؤ میں بسر ہوا۔ دہلی کی مرکزی اہمیت ختم ہونے کے بعد لکھنؤ، شاعروں کا ماوا و ملجا بن گیا تھا۔ دولت کی بے انتہا فراوانی تھی۔ لکھنؤ میں باورچی سے لے کر شاعر تک سب کے سب کسی نہ کسی دربار سے وابستہ تھے اور دربار میں ظاہری حسن ہی وہ خصوصیت تھی جو قبولیت کا درجہ عطا کر سکتی تھی، اسی چیز نے شعر و ادب میں بھی تصنع، ظاہری تراش خراش لفظی صناعی، قافیہ پیمائی اور صنائع بدائع جیسی چیزوں کو رواج دیا۔ ان سب سے بڑھ کر جس چیز نے لکھنوی شاعری کی خارجیت کو فروغ دیا وہ حسن بازاری کی جارہ سامانیاں تھیں جہاں "تو نہیں اور سہی" والا جذبہ کام کرتا ہے۔

وہ شوخ بھر گیا ہے اگر تجھ سے مصحفی، چل تو بھی کوئی اور طرحدار دیکھ لے

لکھنؤ کی فضا میں یہ خارجیت اس خطرناک حد تک رچ بس گئی تھی کہ میر تک اپنا دامن نہ بچا سکا اور اس قسم کے شعر کہنے لگا:۔

لو ان دلوں ہم سے اک رات جانی، کہاں ہم، کہاں تم، کہاں پھر جوانی
بسنتی قبا پر تری مر گیا ہے، کفن میر کو دیجیو زعفرانی

مصحفی کا بھی لکھنؤ کی فضا سے متاثر ہونا بالکل قدرتی بات تھی، تاہم مصحفی اپنے ساتھ چند تہذیبی، معاشرتی اور مذہبی اقدار لائے تھے جس کی پاسداری انھوں نے عمر بھر کی اور اسی وجہ سے مصحفی کے یہاں جو ایک اعتدال اور توازن ملتا ہے وہ ان کے کسی دوسرے ہمعصر شاعر میں نہیں ملتا۔

مصحفی کے تذکروں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں "بمقتضائے رواج زمانہ" شاعری کرنے کے باوجود انھوں نے دہلوی اسکولوں کی اہم اور بنیادی روایات سے انحراف نہیں کیا۔ مصحفی کے یہاں شاعری اور درویشی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کے نزدیک وہی اشعار بہتر ہیں جو "ترازوے نقادان معیار معانی" پر پورے اُترتے ہیں۔ "معانی" پر اتنا زور دینے کے باوجود ان کے ہاں "صحت زبان"، "سلیقۂ نظم"، "مہارت تمام"، "احتیاط محاورہ"، "کلام شستہ و رفتہ"، "زبان بامزہ و شیریں"، "شعر درست" اور "خامۂ اصلاح" کی بھی بہت اہمیت ہے، وہ "معنی بندی" کے نہیں بلکہ "معنی آفرینی" کے قایل ہیں، ایہام گوئی کو "دوست" نہیں رکھتے نہ انھیں "اشعار خیالی" پسند ہیں۔ وہ متقدمین کو اپنا استاد اور ان کی زمین میں اچھے شعر کہنے کو کمالِ فن سمجھتے ہیں۔ ان کے پاس شاعری کی معراج ہی یہ ہے کہ "شعر را سادہ سادہ می گوید"۔ یہ تمام باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ مصحفی کی غیر معمولی متوازن طبیعت نے دونوں جگہوں کے بہترین عناصر کو جذب کر لیا اور ایک ایسا شعری پیکر طیار کیا جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بالکل منفرد ہے۔

مصحفی کی شاعری کا یہی وہ رنگ ہے جہاں لکھنوی رنگ میں دہلوی رنگ کی نمود ملتی ہے۔ اس رنگ میں ایک ایسے لۓ دئے رہنے والی فضا ہے جس سے لکھنؤ کے شاعر قطعاً نا آشنا ہیں۔

مصحفی میں ان دونوں رنگوں کا صحیح اُمزاج ملاحظہ ہو:

آستیں اس نے جو کہنی تک چڑھائی وقت صبح ۔۔۔ آرہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں،

بھیگے سے تیرا رنگ حنا اور بھی چمکا ۔۔۔ پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا
جوں جوں کہ پڑیں منھ پہ تیرے منھ کی بوندیں ۔۔۔ جوں لالۂ تر حسن ترا اور بھی چمکا
اک برق کا سا جھمکا اس مہ لقا سے دیکھا ۔۔۔ میں کیا کہوں کہ اس کو کل کس ادا سے دیکھا
کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں ۔۔۔ پا بہ زنجیر نسیمِ سحری نکلے ہے
اس کی رفتار کا جب مذکور آتا ہے ۔۔۔ جی کی ہوتی ہے یہ حالت کہ رندھ جاتا ہے

تنہا نہ دل اپنا ہی میں زیر و زبر دیکھا ۔۔۔ اس جنبش مژگاں نے عالم کو بہم مارا

تیری رفتار سے اک بے خبری نکلے ہے، ۔۔۔ مست و مدہوش سی جیسے کہ پری نکلے ہے

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر ۔۔۔ شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر

باتوں میں ادھر لعل فسوں گر نے لگایا ۔۔۔ دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

لیکن کہیں کہیں مصحفی "بمقتضائے رواج زمانہ" ابتذال، پھکڑ بازی اور رعایت لفظی کے بھی شکار ہو گئے ہیں۔

مصحفی لکھنؤ آئے تو انھیں دربار سے متوسل ہونا پڑا، اس زمانے میں دربار شاعری کا اکھاڑا تھے۔ جب انشا نے ان کا مضحکہ اڑانا چاہا تو ان سے انشا کی نخوت برداشت نہ ہو سکی اور وہ بھی اپنی "کلاہ کج" کر کے میدان میں اتر آئے۔

مصحفی "تخت شہی" پر "گوشۂ عزلت" کو ترجیح دینے والوں میں سے تھے۔ اس کے علاوہ مصحفی کی فطرت میں کسی کو نیچا دکھانا، برا کہنا یا بدنام کرنا بالکل نہیں تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت خود ان کے تذکرے ہیں، جس سے ان کی سیرت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ انتہائی معرکہ آرائی ہونے کے باوجود مصحفی نے جس فراغ دلی اور منصف مزاجی سے ان کی تعریف کی ہے اسے دیکھ کر ان کی شرافت نفس کا قایل ہونا پڑتا ہے۔ حالانکہ وہ چاہتے تو اپنے تذکرے میں انشا کی کمزوریوں سے ضرورت سے زیادہ فایدہ اٹھا سکتے تھے۔ مصحفی کی طبیعت کو ظرافت، چلبلے پن، پھکڑ بازی یا فحش سے قطعی لگاؤ نہیں تھا۔ اس کے برخلاف ان کی طبیعت میں سنجیدگی، ثقاہت، دردمندی اور سوز و گداز تھا۔ انشا کے انتقال پر اپنے زندہ رہنے کو بے کار اور فضول جاننا انکی ان ہی خصوصیات کا مظہر ہے، کسی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ "مصحفی بلاشبہ اپنے دور کے شعراء میں سب سے زیادہ متین، سب سے زیادہ مہذب اور سب سے زیادہ سنجیدہ ہیں۔" اور یہی وجہ ہے کہ مصحفی بعض وقت اپنی قادرالکلامی، کہنہ مشقی، استادی، "انتخابیت و تقلید" اور غیر معمولی "قوت اخذہ" کے باوجود انشا کے رنگ پر پڑ کر متبذل اور ناقابل برداشت ہو گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پارہ اگر تھالی میں رہے تو چاہے کتنا ہی گھومے کچھ فرق نہیں پڑتا، لیکن یہی پارہ جب اپنی تیزی میں تھالی سے باہر نکل جاتا ہے تو گر جاتا ہے، یہی حال شخصیت اور شاعری کا ہے جب شاعری شخصیت کے دائرہ میں حرکت کرتی ہے تو باوجود تیزی اور تندی کے اپنا وقار قایم رکھتی ہے لیکن جب وہ شخصیت کے حدود سے باہر نکل جاتی ہے تو اپنے مقام سے گر جاتی ہے۔ مصحفی کی طبیعت میں شوخی، ظرافت وغیرہ تو تھی نہیں، مولانا محمد حسین آزاد کا یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ مصحفی اکڑ کر چلتے ہیں تو ان کی گردن نکل جاتی ہے، لیکن ان کا یہ کہنا کہ اس کا سبب مصحفی کا "بڑھاپا" یا "امرد مہین" ہے۔ بالکل غلط ہے۔ چونکہ مولانا آزاد کو مصحفی سے کوئی دشمنی تھی نہ ہمدردی، اس لئے انھوں نے مصحفی سمجھنے کی قطعی کوشش نہیں کی اس لئے نہ تو وہ مصحفی کی شخصیت سے انصاف کر سکے ہیں نہ ہی ان کی شاعری سے۔ خیر محمد حسین آزاد کا کیا ہے انھوں نے کس شاعر کے ساتھ انصاف کیا جو مصحفی کے ساتھ کرتے۔ شکایت تو مجنوں گورکھپوری جیسے نقاد سے پیدا ہوتی ہے، جو ان نقادوں میں سے ہیں جنھوں نے مولانا آزاد کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کو دور کر کے مصحفی کی عظمت اور اہمیت کو ثابت کیا ہے۔ مجنوں صاحب نے مصحفی کو صرف "روایات اور صور" کا شاعر کہا ہے اور لکھا ہے کہ "ان کی شاعری کے محرکات زندگی کے تجربات اتنے نہیں جتنے کہ خالص شاعری کے تجربات"۔ یہی نہیں بلکہ ان کے کہنے کے مطابق مصحفی کو "شاعر بنانے کے لئے تخیل اور اساتذہ کے کلام کافی تھے"۔ حالانکہ مصحفی کی وہی شاعری آنکھوں میں جگہ پانے کے قابل اور قابل قدر ہے جس کے محرکات زندگی کے تجربات ہیں۔

مصحفی کی شاعری کے محرکات بعض جگہ یہ اس قدر نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں کہ اس کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہو جاتا ہے جیسے

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پر نسیم، ۔۔۔ کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھیرے گا

اس سے نہ صرف مصحفی کی شخصیت اور ان کی افتاد طبیعت پر روشنی پڑتی ہے بلکہ یہ ان کی زندگی کے اہم واقعات کا

خلاصہ بھی ہے۔ مصحفی جہاں کہیں بھی آسودگی اور خوش حالی کا امکان دیکھتے وہاں چلے جاتے کیونکہ ان کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ بغیر کوشش اور جستجو کے کوئی چیز ہاتھ نہیں آتی۔

شیخ کعبہ سے اُٹھ نکل باہر گھر میں بیٹھے خدا نہیں ملتا

وہ ہمیشہ "جرس غنچہ کی صدا" پر چلتے رہے۔ اسی لئے امروہہ سے نکل کر دہلی آئے، ٹانڈہ گئے، آنولہ کی بھی سیر کی، لکھنؤ میں قسمت آزمائی کی ہر جگہ سے مایوس ہو کر پھر دہلی گئے، لیکن دوبارہ انھیں لکھنؤ آنا پڑا۔ وہ تہی دامن ہی رہے، "قافلۂ بہار" ان کے لئے کہیں بھی نہیں ٹھیرا ؎

خالی ہی چلے آتے ہیں ہم صحنِ چمن سے دامان میں کچھ ہے نہ گریبان میں کچھ ہے

مصحفی "راہ دور و دراز" طے کر کے لکھنؤ آئے۔ یہاں بھی "بجز نشیب و فراز" انھیں کچھ نہیں ملا۔ سفر کرتے کرتے مصحفی اب تھک چکے تھے اور "منزلِ مقصود" کا ابھی تک پتہ نہیں تھا۔ خود ان میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ سرگرم سفر رہیں۔ پھر عمر کا کارواں بھی کافی دور نکل چکا تھا ؎

کارواں دور گیا پاؤں تھکے جی ہارا کون اب منزلِ مقصود کو پہونچائے مجھے

مصحفی نے مختلف شہروں میں قسمت آزمائی کی تھی۔ حالات اور واقعات نے انھیں اتنی اجازت نہیں دی کہ کسی بھی جگہ اطمینان سے رہ سکیں۔ خود لکھنؤ میں گو کہ وہ مستقل طور پر رہ پڑے تھے، لیکن جیسا کہ ان کے تذکروں سے ظاہر ہے کسی ایک جگہ جم کر سکون سے رہنے کی نوبت نہیں آئی۔ کبھی کسی امیر کے دربار سے متوسل ہو گئے تو کبھی کسی نواب کے ہاں رہنا پڑا ؎

اپنی تو اس چمن میں اس طرح عمر گزری یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا

دیکھئے یہی بات جب غزل کے خاص رمز و کنایہ میں بیان ہوتی ہے تو یہی "غمِ دوراں" کس طرح "غمِ جاناں" بن جاتا ہے :-

میں اک دم چین سے کوچے میں اس بت کے کہاں بیٹھا کبھی اُٹھ کر یہاں بیٹھا کبھی اُٹھ کر وہاں بیٹھا

مصحفی نے کئی شہروں کی خاک چھانی۔ ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ سفر و حضر میں گزرا، اسی وجہ سے ان کے کلام میں قافلہ، کارواں منزل، جرس، سیر کرنا، دیکھنا، پھرنا جیسے الفاظ کی کثرت ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند شعر ملاحظہ فرمائیے :-

جس بیاباں خطرناک سے اپنا ہے گزر مصحفی قافلے اس راہ سے کم تر نکلے

رہزن قافلہ دل ہوئیں جب وہ آنکھیں پہلے اسباب لٹا صبر و شکیبائی کا

کر دل کی ذرا سیر کہ ہے سیر اسی میں، کعبے کی اسی میں ہے بنا، دیر اسی میں،

منظور کب تھا کعبہ و بتخانہ دیکھنا دونوں جگہ تھا جلوۂ جانانہ دیکھنا

حسرت پر اس مسافرِ بیکس کی روئیے جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

منھ اُٹھ گیا جدھر کو اُدھر ہی چلے گئے آدرگانِ شوق کو منزل سے کیا خبر

انھوں نے اپنے تذکرہ میں بار بار دہلی کے مشاعروں، مجلسوں اور دلچسپ صحبتوں کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ دن جلد ہی بیت گئے ایسا ہی واقعہ ٹانڈہ میں پیش آیا جس کا ذکر مصحفی نے بڑی حسرت سے کیا ہے، محمد یار خاں امیر رئیس ٹانڈہ کی سخن سنجیوں کی وجہ سے ٹانڈہ میں شعر و سخن کی محفل آراستہ ہو گئی تھی۔ مصحفی بھی قائم کی وساطت سے دربار سے متوسل ہو گئے لیکن صرف تین ہی مہینے لطف سے گزر سکے تھے کہ یہ دربار بھی لٹ گیا ؎

کم نصیبی کا گلہ ہے کہ ہم اس دم پہونچے گر کے جب ہاتھ سے ساقی کے سبو ٹوٹ گیا
ایسا بھی اتفاق زمانے میں کم ہوا قاصد کو موت آئی زمانہ رقم ہوا

مصحفی کو پورا احساس تھا کہ زمانہ کا رنگ ایسا ہی ہوتا ہے۔ زندگی کے مسلسل تجربات نے ان پر یہ بات ظاہر کر دی تھی کہ آسودگی کبھی بھی میسر نہیں آسکتی ہے۔ اسی وجہ سے مصحفی میں ترسنے کی کیفیت آگئی ہے۔ مصحفی نے اپنی ناآسودگی کا اظہار بار بار کیا ہے ؎

بیٹھا یہاں جو آکے بہانے سے اُٹھ گیا آسودگی کا حرف زمانہ سے اُٹھ گیا
اس چمن میں ہم نہیں شرمندہ اس گل کے نسیم گو کہ اوروں نے دماغ آرزو خوشبو کیا
ہم اسیرانِ قفس کو تب خبر دی تو آہ لٹ گئے جب باغ میں پھولوں کے خرمن اے صبا
کچھ ایسی عداوت ہے کہ جب ہو مری نوبت ساقی سے یہ کہتے ہوا سے جام نہ دینا

یہی بات تھی کہ مصحفی اطمینان اور آسودگی میں بسر کئے ہوئے قلیل زمانے کو بھی یاد کیا کرتے تھے۔ ٹمانڈہ کی پر لطف صحبتوں کو مصحفی زندگی نہیں بھول سکتے تھے۔ تذکرہ ہندی جو ان کے بڑھاپے کی یادگار ہے۔ اس میں انھوں نے اس صحبت کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے :۔ "واللہ کہ یاد آں صحبت گزشتہ داغ ناکامی بر دل دردمندی گزارد" اس کے باوجود وہ اگلی صحبتوں کے لئے روتے نہیں ہیں کیونکہ اس سے پہلے دہلی کی صحبتوں کا بھی حشر دیکھ چکے تھے ؎

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

وہ زمانہ کے چلن سے واقف تھے۔

وہی ٹھوکر ہے اور وہی انداز اپنی چالوں سے تو نہ آیا باز

اور اسی تجربہ نے انھیں قنوطی ہونے سے بچا لیا، بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ پُرامید رہے کہ جب وہ زمانہ نہیں رہا ہے تو یہ بھی نہیں رہے گا ؎

مت میرے رنگ زرد کا چرچا کرو کہ یاں رنگ ایک سا کسی کا ہمیشہ نہیں رہا

اسی لئے کبھی وہ "جرس غنچہ کی صدا" پر جاتے ہیں تو کبھی "نسیم سحری" کا ساتھ نہیں چھوڑتے ؎

کل قافلۂ نکہت گل ہوگا روانہ مت چھوڑیو تو ساتھ نسیم سحری کا

انہی اسباب کی بنا پر وہ اپنا دل سفر پر رکھتے ہیں اور ہمیشہ اُٹھ چلنے کے لئے طیار رہتے ہیں ؎

مصحفی چاہئے کیا پھر اسے اُٹھ چلنے کو جس مسافر نے کہ دل اپنا سفر پر رکھا

مصحفی سفر کرتے لکھنؤ پہونچتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ یہاں بڑی امیدوں سے آئے تھے لیکن یہاں انھیں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور یہاں بھی وہ فکر معاش سے نجات نہ پاسکے، مرزا علی لطف نے لکھا ہے :۔ "۱۲ برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے ضیق معاش تو وہاں نصیب اہل کمال ہے اسی طور پر درہم برہم اس غریب کا بھی احوال ہے" ضیق معاش میں تو مبتلا ہی تھے پھر انشا کی وجہ سے "اس شہر میں رہنا" اور دشوار ہو گیا کیونکہ یہاں "انسان تو تیر" نہیں ہوتی تھی۔ ایسی حالت میں دوسرے امیروں اور دوستوں نے بھی جیسا کہ چاہئے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں "بے ادائی دوستاں زبانی" اس "بے ادائی" کا مصحفی کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا۔ جس کا اظہار انھوں نے بہت سے اشعار میں کیا ہے ؎

جو ملا اس نے بے وفائی کی کچھ عجب رنگ ہے زمانہ کا
ہم نام ہی سنتے ہیں فقط مہر و وفا کا آنکھوں سے کہیں مہر و وفا کو نہیں دیکھا

اور سب کچھ جہاں میں ملتا ہے لیکن اک آشنا نہیں ملتا

جاؤں میں کس کے پاس مرا آشنا ہے کون دُنیا میں بے وفا ہیں سبھی باوفا ہے کون

اے دل تلاش یار میں پھرتا ہے تو عبث خواہش عبث، امید عبث، آرزو عبث

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

اس شعر کا اظہار بیان منفرد ہے۔ خصوصاً دوسرا مصرع "کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے"۔ مصحفی کے ان کے اپنے ذاتی تجربات و واقعات کا مرقع ہے۔

بہرکیف مصحفی کو لکھنؤ میں بھی آرام نہیں مل سکا اور وہ اُس قدر برگشتہ خاطر ہوئے کہ گوشہ نشینی اختیار کرلی ؎

ہے یہاں کس کو دماغ انجمن آرائی کا اپنے رہنے کو مکاں چاہیے تنہائی کا

تہمت ہے مصحفی پر سیر چمن کی یارو کب گھر سے باہر وہ سوگوار نکلا،

کنج قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر فصل بہار باغ میں دھومیں مچا گئی،

اس بات کی تصدیق ان کے تذکرے سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے:۔ "من مسکین از بے ادائی دوستاں زبانی زباں نطق بکام کشیدہ بگوشہ عزلت و قناعت گلیم سیہ بختی بر دوش افگندہ گمنام وار بسر می بردم و بر شعر و شاعراں و ملاقات امیراں مہرامی کردم"۔ انھوں نے لکھنؤ چھوڑنے تک کا بھی ارادہ کرلیا تھا ؎

اب چلئے کہیں کو لکھنؤ سے اے مصحفی یاں بہت رہے ہم

مصحفی کو دہلی شدت سے یاد آنے لگی وہ دہلی کو اپنا وطن کہتے تھے اور اس کے لئے زندگی بھر تڑپتے رہے۔ بہت ممکن ہے حسب ذیل شعر مصحفی نے اس وقت کہا ہو، جب تمام دہلی کے شاعر اور وہ خود بھی دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔ کیونکہ دہلی سے مصحفی کو جو جذباتی لگاؤ تھا اس سے یہ چیز بعید نہیں ؎

اُٹھتے تو ہیں یہ مجلسیاں پر میں ہوں حیراں مجلس سے تری اُٹھ کے کدھر جائے گا کوئی

دہلی سے اُٹھ آنا کوئی آسان بات نہیں تھی ؎

فغاں جرس کی مگر تھی نہ ایسی درد آمیز قضائے قافلہ کوئی تو بے قرار رہا

مصحفی اپنے "اُجڑے دیار" ہی کو "چمن" سمجھتے تھے اور اسے یاد کرتے تھے ؎

غربی میں خبر کس کو وطن والوں کی، کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی

کنج قفس سے چھوٹ کے پہونچا نہ باغ تک حسرت پہ جی میں مرغ گرفتار لے گیا

خوش حال ان کا وے جو گلستاں میں مر گئے حسرت نصیب ہم تھے کہ زنداں میں مر گئے

گو مصحفی، لکھنؤ سے بیزار ہو چکے تھے، اپنے چمن گلستاں اور باغ کی یاد بھی انھیں بہت ستاتی تھی۔ لیکن اب ان کے لئے دہلی جانا ممکن نہ تھا۔ وہاں رکھا ہی کیا تھا ؎

کیا کریں جا کے گلستاں میں ہم آگ رکھ آئے آشیاں میں ہم

غرض کہ جس طرح بن پڑا مصحفی نے زندگی کے دن کاٹ دئے ؎

شمع صفت مصحفی اس بزم میں جوں بنی دوں عمر بسر گیا،

مصحفی نے اس بزم میں "جوں بنی دوں" کی جو زندگی بسر کی ہے اس کا اظہار شاعری میں بھی پوری طرح کیا ہے اور جہاں بھی اس کا اظہار ہوا ہے وہاں مصحفی کی انفرادیت بھی ظاہر ہو گئی ہے۔

جگر و کلامِ جگر

(قیسی الفاروقی)

حضرت جگرؔ نے میر انیسؔ کی طرح ذوقِ شعری ورثہ میں پایا تھا۔ جدِ امجد، والد ماجد، اور دیگر اعزہ بھی شاعر تھے، خاندان جدی مولویوں کا تھا۔ جس کے کچھ افراد پھوپھا وغیرہ شیعی عقاید رکھتے تھے اور حضرت جگرؔ بھی ان سے متاثر تھے۔ حضرت داغؔ دہلوی کو ایک غزل اصلاح کے لئے بھیجی تھی، مگر ان کے استاد رسا رامپوری ہی تھے۔ ان کو روحانی فیض شاہ قاضی عبدالغنی منگلوری مرحوم کی نسبت اور حضرت اصغرؔ گونڈوی کی صحبت سے پہونچا۔

حضرت شاہ عبدالغنی منگلوری سے جو نسبت تھی اس کا بھی اظہار بار بار کیا ہے:۔

پابندِ شریعت نبی ہوں — خاکِ درِ دولتِ غنی ہوں
قاضیا یک نظر بسوئے جگرؔ — آں کہ یک خادم است و حلقہ بگوش
خاک منگلور است چوں دامن نشاں — از دو عالم دست افشاں می روم

لیکن اصغرؔ صاحب نے ان کی زندگی کو ایک نیا موڑ اور ان کی شاعری کو ایک نیا رخ دیا۔ چنانچہ جگرؔ نے اصغرؔ کے ذکر کے ساتھ انکے فیوض و برکات کا ذکر اور اعتراف بھی بار بار کیا ہے:۔

حریمِ حسنِ معنی ہے جگرؔ کاشانۂ اصغرؔ — جو بیٹھو باادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہو کر
یوں تو ہونے کو جگرؔ اور بھی ہیں اہلِ کمال — خاص ہے حضرت اصغرؔ سے ارادت مجھ کو
کیا دن تھے جگرؔ وہ دن جب صحبتِ اصغرؔ میں — مسرور طبیعت تھی محرور[1] مرا دل تھا
نگاہِ حضرت اصغرؔ کی ہے ودیعت خاص — قرار بن کے جگرؔ کے دلِ حزیں میں رہی
میں سُن کے حضرت اصغرؔ کے اے جگرؔ اشعار — وہ مست ہوں کہ کوئی پی کے بادہ محوار نہ ہو
کہو نکتہ بہار شعر سے ٹپکے نہ اے جگرؔ — رنگِ کلامِ حضرت اصغرؔ نظر میں ہے
بدن سے جان بھی ہو جائے گی رخصت جگرؔ لیکن — نہ جائے گا خیال حضرتِ اصغرؔ مرے دل سے

زمانۂ رندی میں یہ کہنا کہ جگرؔ صاحب فلاں مقام پر ہوں گے مشکل تھا۔ یہ ضرور ہے کہ یہ وقت زیادہ تر آگرہ، لکھنؤ، مین پوری، کان پور میں گزرا ہے، مگر اس زمانہ میں بھی ان کے احباب ان کی فکر رکھتے تھے کیونکہ خود انھیں اپنے تن کا بھی ہوش نہ تھا۔ سفر، شراب اور شاعری یہی ان کی زندگی تھی۔ اور جہاں جہاں سے یہ ہو کر گزرے ہیں اپنی ادائے خود فراموشی و سرشاری کی یاد چھوڑ گئے ہیں۔

جگرؔ صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام "داغِ جگر" مرزا احسان احمد صاحب کی کاوش اور صحبت سے اعظم گڑھ سے شایع ہوا۔ دوسرا مجموعۂ کلام "شعلۂ طور" پہلے لکھنؤ سے شایع ہوا اور پھر لاہور سے۔ تیسرا مجموعۂ کلام "آتش گل" پاکستان سے شایع ہوا اور اس کا دوسرا

---

[1] "محرور" غضبناک کو کہتے ہیں، اس لئے ہو سکتا ہے جگرؔ نے کوئی اور لفظ استعمال کیا ہو۔ (نیاز)

اڈیشن مع تازہ اشعار کے "الفرقان پریس لکھنؤ" سے۔ لیکن نہ کسی ناشر نے ان سے اجازت لی نہ انھوں نے کبھی اس کی پروا کی۔ اب ہندی میں بھی ان کے کلام کا انتخاب چھپ چکا ہے۔ ناشر نے اجازت طلب کی تھی، مگر ابھی خط کا جواب نہیں گیا تھا کہ ہندی اڈیشن چھپ گیا۔

حضرت جگر کو کبھی نام و نمود اور اعزاز و دولت کی خواہش نہیں ہوئی، روپیہ بہت آیا مگر خرچ کی رفتار ہمیشہ زیادہ رہی حیدرآباد میں شاہزادہ معظم جاہ بہادر کے استاد کی حیثیت سے قیام کرنے سے انکار کیا۔ "فلم کمپنیوں" کی پیش کش بھی نامنظور کر دی۔ ایک بار کچھ کام کیا تو کوئی ایسا خواب دیکھا کہ دوسرے دن بمبئی چھوڑ دیا۔ انھیں محسوس ہوا کہ فلم کی تمام آبادی غلیظ ہے۔ پاکستان نے انھیں ہر طرح نوازنا چاہا مگر انھوں نے وہاں ٹھہرنا پسند نہیں کیا۔

حضرت جگر اور ان کے بھائی محمد احمد صاحب کو اردو، فارسی کی تعلیم مراد آباد میں مولانا معین الدین صاحب نزہت نے دی۔ پھر چچا ظفر علی کے ساتھ اور بعد میں لکھنؤ میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ انگریزی تعلیم نویں درجہ تک ہوئی۔ انگریزی سے کوئی مناسبت پیدا نہیں ہوئی مگر ادب، انسانیت اور اخلاق کی تعلیم خاندانی تربیت اور ماحول سے ہوئی، کچھ زمانہ نے، عسرت اور تنگدستی نے سکھایا اور یہ اسی کا ردِ عمل تھا کہ کوئی سایل، کوئی غریب، کوئی مدد کا طالب اُن کے پاس سے مایوس واپس نہیں گیا۔

حضرت جگر کا کلام ان کی زندگی کے بہت واضح نقوش پیش کرتا ہے، غزل جیسی نازک اور لطیف صنف سخن میں شاعر کی داخلی زندگی پردے میں نہیں رہ سکتی۔ حضرت جگر کے کلام میں یہ پہلو بہت نمایاں ہے، یہ حُسن و عشق کے شاعر ہیں۔ انھوں نے محبت کی ہے ان سے محبت کی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض غزلیں حسن و عشق کے معاملات کی بہت معمولی اور سطحی باتیں پیش کرتی ہیں مگر جگر نے آپ بیتی بیان کرنے میں تکلف سے کام نہیں لیا ہے۔ چنانچہ "گوری گوری کلائیاں" "وہ زلف پریشاں تا کمر" قسم کی غزلیں نظم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہی —— "اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے" کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے مگر ان تمام اشعار میں صداقت ہے اور یہی حضرت جگر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

حصول مسرت کی تین صورتیں ہیں، اس میں سب سے ادنیٰ درجہ کی خوشی لذت جسمانی ہے اس سے بلند تر سرور قلب و دماغ ہے اور سب سے بلند "انبساط روح"۔ حضرت جگر کے یہاں جسمانی لذت کی طلب بھی تھی اور دل و دماغ کی مسرت بھی، لیکن وہ کم یہ زیادہ —— "شعلۂ طور" اور "آتشِ گل" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ "شعلۂ طور" میں شاعر لذتِ آسماں کی طرف بڑھ رہا تھا مگر لاشعور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب اور حضرت اصغر گونڈوی کے فیوض سے مالا مال ہو رہا تھا اور غیر محسوس طور پر شاعر "لذت آسماں" کو چھوڑ کر "لذت دشوار" کا طالب نظر آتا ہے۔ اول اول آگرہ میں وحیدن سے محبت کی، اور پھر شادی۔ لیکن یہ قرب بھی دیرپا ثابت نہ ہوا اور وحیدن کا مراد آباد میں انتقال ہو گیا۔ ان سے کوئی اولاد نہ تھی۔

قسمت نے اصغر صاحب سے ملا دیا اور اصغر صاحب نے نسیم سے شادی کرا دی، کچھ شراب کی عادت، کچھ طبائع کا اختلاف، کچھ فطری لاپروائی، جس آسانی سے شادی ہو گئی تھی اتنی ہی خاموشی سے طلاق ہو گئی۔ اور اصغر صاحب نے نسیم سے عقد کر لیا۔ اس سے پہلے اصغر صاحب سے نسیم کی بڑی بہن منسوب تھیں اور ان سے کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کی خواہش پر طلاق ہو گئی اور انھیں کی ایما سے نسیم سے شادی ہوئی۔ یہ ایسے واقعات تھے کہ جگر صاحب ان کی تاب نہ لا سکے اور اس دور میں ان کی یہ کوشش رہی تھی کہ انھیں کسی وقت ہوش نہ آئے۔

جگر صاحب کے ایک دوست اصغر حسین صاحب انھیں مین پوری میں اپنے پاس لے گئے اور وہاں انھیں ایک بالانشین کے پاس پہونچایا جو نسیم سے کچھ مشابہ تھیں، وہاں آنا جانا ہوا لیکن اسی دوران میں اصغر کا انتقال ہو چکا تھا۔ دل پر اپنی شکست کا احساس اب بھی بوجھ بنا ہوا تھا۔ پھر بھی ناقدری بھی نشتر کی طرح چبھتی تھی۔ پھر نسیم کو پیغام دیا۔ پہلے انکار ہوا۔ پھر ترکِ شراب کی نوبت آئی، پھر منگلور شریف کے اثرات اور رشید احمد صاحب صدیقی کی کوششوں سے تجدید عہد و پیمان ہوئی۔ حضرت جگر کے کلام میں جگر کیفیت رند جگہ جگہ موجود ہیں:۔

اس وقت اک خمار تھا ہر دم سرور تھا بوتل بغل میں تھی کہ دلِ ناصبور تھا

میکشی ہے تو پھر شانِ میکشی کیا ہے، بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے

حرم و دیر میں رندوں کا ٹھکانا ہی نہ تھا وہ تو یہ کہئے اماں مل گئی میخانے میں

یہ حضرت جگر کے زمانۂ رندی کی صحیح تصاویر ہیں۔ اس کے بعد یہی رندی کچھ شائستہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً:-

کچھ ایسے اب بھی ہیں رندانِ پاکباز جگر کہ جن کو بے مے و ساغر پلائی جاتی ہے

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ مجھے مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

رندوں کو بہت نہ چھیڑو واعظ ان میں بھی ہیں کچھ خدا رسیدہ

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں،

"آتشِ گل" میں اس کا یہ رنگ ہو جاتا ہے:-

زندگی سلسلۂ خواب گراں ہے ساقی لا تو وہ فتنۂ بیدار کہاں ہے ساقی

حضرت جگر کو ساقی کی شراب سے زیادہ ساقی کی "مست نگاہی" کی طلب تھی:-

ساقی کے فیضِ مست نگاہی کے بس نثار ایک ایک موجِ مے کو رگِ جاں بنا دیا

شیشے سے نہ رکھ مطلب اے ساقیِ میخانہ ان مست نگاہوں سے بھر دے میرا پیمانہ

مجھ کو شکوہ ہے چشمِ ساقی سے پی رہا ہوں مگر سرور نہیں،

اپنے منصب کا نہ احساس نہ رندوں کی خبر دیر سے آج خدا جانے کہاں ہے ساقی

اُٹھا تعظیم کو ساقی جھکے شیشے، بڑھے ساغر نہ جانے آخر شب کون رندِ تشنہ کام آیا

حضرتِ جگر کے یہاں "حُسن" کا تصور یہ ہے:-

حُسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے،

حُسن کو سمجھا ہے کیا اے بے خبر حسن معنی بھی ہے صورت ہی نہیں

بے ربط حُسن و عشق یہ کیف و اثر کہاں تھی زندگی عزیز مگر اس قدر کہاں

نسیم سے پہلے حضرت جگر کے یہاں حُسن کی پرستش مادی تھی اس کے بعد سیرت کا بھی احساس ہوا۔ جگر کی نظم "تجدیدِ ملاقات" پڑھنے والا نسیم کے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچے گا۔ حالانکہ حضرت جگر اور نسیم دونوں ہی اس وقت ادھیڑ عمر کے تھے اور شباب کے منازل سے بہت آگے نکل آئے تھے۔ حضرتِ جگر نے "تجدیدِ ملاقات" میں جو کچھ فرمایا ہے، وہاں نسیم کا وجود بھی نہیں ہے، جگر کا تصور ہے، جگر کا لب و لہجہ ہے، جگر کا شعور ہے، جگر کا حُسن ہے، جگر کے جذبات ہیں۔

"داغِ جگر"۔ "شعلۂ طور"۔ اور "آتشِ گل" تینوں مجموعے جذباتِ عشق سے معمور ہیں، مگر بہ لحاظ اندازِ بیان ان میں کافی فرق ہے مثلاً:-

محبت اثر کرتی ہے چپکے چپکے محبت کی خاموش چنگاریاں ہیں

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی،

جب کوئی عشق میں برباد جہاں ہوتا ہے مجھ کو محسوس خود اپنا ہی زیاں ہوتا ہے

وقت آتا ہے اک ایسا بھی محبت میں کہ جب دل پہ احساسِ محبت بھی گراں ہوتا ہے

بیٹھے ہیں بزمِ دوست میں گم شدگانِ حسن و دوست عشق ہے اور طلب نہیں نغمہ ہے اور صدا نہیں

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

آتشِ عشق وہ جہنم ہے جس میں فردوس کے نظارے ہیں

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے　　یہ شاخ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا　　کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

سب کچھ لٹا کے راہِ محبت میں اہلِ دل　　خوش ہیں کہ جیسے دولت کونین پا گئے

حضرت جگر کی زندگی میں یاسیت نہیں ہے۔ غم ایک فطری چیز ہے مگر "غم پیشگی" سے وہ متنفر ہیں۔ ان کے وہاں "ضبطِ غم" ہے، "فرطِ غم" نہیں:-

اس کو بھی جگر دیکھ لیا خاک میں ملتے　　وہ اشک جو تھا گوہر یک دانہ کسی کا

ہائے وہ سلسلۂ اشک کہ جو تیرے حضور　　دل میں رکتا ہے نہ آنکھوں سے رواں ہوتا ہے

لہو آتا نہیں کھنچ کر مژہ تک　　نہ آئے گی بہار ابکی برس کیا

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے　　کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

عرصہ ہوا کہ رسمِ محبت بدل گئی　　دامن سے اب معاملۂ چشمِ تر کہاں

سنجیدگی ہزار ہو غم سے مفر نہیں　　دریا اسی میں بند ہے جو آنکھ تر نہیں

حضرت جگر کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ان کے کلام اور ان کی زندگی میں مطابقت ہے۔ حضرت جگر کے یہاں کیف ہے، اثر ہے، جذب ہے، اثر ہے، صداقت ہے، جگر کے شاہد و ساقی، رند و زاہد، زندہ حقیقتیں، جیتی جاگتی شخصیتیں ہیں۔ جگر کے یہاں بہت سے ایسے اشعار ہیں جن سے واقعات وابستہ ہیں۔ یادیں زندہ ہیں، جن سے کوئی دبی ہوئی چنگاری ابھری ہے۔ حضرت جگر کی انفرادیت ان کے اشعار میں ایک خاص کیف، ایک خاص اثر پیدا کرتی ہے جس سے آپ لطف اندوز تو ہوتے ہیں، مگر اس کی کیفیت بیان نہیں کر سکتے

ہمیں بھی نہ اب چین آئے گا جب تک　　ان آنکھوں میں آنسو نہ پھر لائیے گا

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل　　کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

غمِ نشاط و سرور و الم نہ پوچھ جگر،　　کبھی جب اس نے بہ چشم پر آب دیکھ لیا

چشمِ پرنم زلفِ آشفتہ نگاہیں بے قرار　　اس پشیمانی کے صدقے میں پشیماں ہو گیا

پھر حسنِ منفعل متبسم ہے زیرِ لب　　یک قطرہ اشک زینتِ مژگاں کئے ہوئے

آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں　　نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

صد عشرتِ نگاہ مسلسل خوشا نصیب　　لیکن لطافتِ نگہِ مختصر کہاں

خوب روئے فراق میں اے دل،　　کچھ طبیعت ہی سنبھل جاتی ہے

یہ کیا مقامِ عشق ہے ظالم کہ ان دنوں،　　اکثر ترے بغیر بھی آرام آ گیا،

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر　　جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

الٰہی خیر یہ کیا شام ہی سے عالم ہے　　کہ جیسے آج ستاروں میں روشنی کم ہے

مجھے تھا شکوۂ ہجراں کہ یہ ہوا محسوس　　مرے قریب سے ہو کر وہ ناگہاں گزرے

وہ موت سے نہیں گھبراتے تھے، گزشتہ دو سال کی علالت میں بارہا موت کا ذکر کیا اور فرمایا کہ "بھئی میں موت سے نہیں ڈرتا بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہونا ہے وہ جلد ہو جائے"

اس باب میں ان کے تاثرات یہ تھے:-

موت اک دامِ گرفتاری تازہ ہے جگر　　یہ نہ سمجھو کہ غمِ عشق نے آزاد کیا

دل کو سکون روح کو آرام آگیا — موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

قریب منزلِ آخر ہے افراقِ جگر — سفر تمام ہوا نیند آئی جاتی ہے

آئی ہے موت حسن کا منظر لئے ہوئے — لیکن غمِ حیات کمر لئے ہوئے

زندگی بھی کم حسین نہیں ہے اور نہ زندگی کے آلام سے فرار حضرت جگر کے وہاں ہے۔ حضرت جگر بڑے بلند اخلاق کے انسان تھے۔ اور ہر کس و ناکس پر اعتماد کر لیتے تھے۔ انھوں نے انسان کی کافی تلاش کی لیکن وہ بہت کم ملا۔

اب کہاں انساں جسے انساں کہیں — چلتی پھرتی دیکھ لو پرچھائیاں

سخت خونریز جب آشوبِ جہاں ہوتا ہے — نہیں معلوم یہ انسان کہاں ہوتا ہے

آدمی کے پاس سب کچھ ہے جگر — ایک تنہا آدمیت ہی نہیں،

ہر چند کائنات دو عالم میں اے جگر — انسان ہی ایک چیز ہے انساں مگر کہاں

یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی — کہ انساں عالمِ انسانیت پر بار ہو جائے

حضرت جگر کو وطن سے بے انتہا محبت تھی۔ میں نے ان سے ایک دن کہا کہ آپ مسلسل ایک جگہ رہتے رہتے گھبرا گئے ہیں۔ حیدرآباد، کشمیر یا پاکستان کا سفر اختیار کریں تو طبیعت کچھ بہل جائے گی۔ فرمایا کہ "جی ہاں، یہ تو ٹھیک ہے مگر میری موجودہ حالت میں موت کسی وقت آسکتی ہے اور میں کہیں اور مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنا وطن عزیز ہے"۔ میں نے ان سے کہا کہ:۔ "آپ پر یہ اعتراض ہے کہ آپ نے "حب الوطنی" کے خلاف کچھ نظمیں لکھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو وطن عزیز نہیں ہے"۔

فرمایا "جی ہاں، ہر وہ شخص جو ان اشعار کو پڑھتا ہے یہ غور نہیں کرتا کہ شاعر کا مقصد کیا ہے، وہ ان اشعار کا خلوص نہیں دیکھتا یا اس حق کو تسلیم نہیں کرتا کہ شاعر اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا حق رکھتا ہے وہ بدظن ہو سکتا ہے اور وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ شاعر اپنے وطن کو کس مقام پر دیکھنا چاہتا ہے"۔

ایک اور موقع پر فرمایا:۔ "شاعر جب وقتی طور پر کسی جذبے سے مغلوب ہوتا ہے تو وہ اس تاثر کو اشعار میں ظاہر کرتا ہے۔ کسی نظام سے آسودہ نہ ہونا اور وطن سے محبت رکھنا اور چیز ہے، میں حقیقت نگاری کو "مصلحت آمیز" پر ترجیح دیتا ہوں"۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ:۔ "سیاست سے مجھے کوئی مناسبت نہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ اگر ایک سیاسی جماعت ملک میں ایسی بن جائے، جو وزارت قبول نہ کرے بلکہ حکمراں طبقہ اور عوام میں رابطہ پیدا کرے اور حکمراں طبقہ کی نگرانی کر سکے تو حالات سدھر سکتے ہیں"۔

آزادیِ وطن سے پہلے کی بہت سی نظمیں جو جذبۂ وطن پرستی کے تحت کہی تھیں وہ سرشاری کے نذر ہو گئیں، گو وہ غزل گو شاعر تھے اور وطنی شاعری کے لئے نظم زیادہ موزوں ہے تاہم پھر بھی "ملک"۔ "اسٹرائک"۔ "محمد علی"۔ "گاندھی" جیسی نظموں سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ حضرت جگر بحیثیت شاعر وطن پرستی کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔

مثلاً ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو:۔

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی — خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

سلامت ہو ترا میخانہ تیری انجمن ساقی — مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

رگ و پے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی — مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجِ زن ساقی

کبھی میں بھی تھا شاہد در بغل توبہ شکن مے کش — مگر بننا ہے اب خنجر بکف، ساغر شکن ساقی

نہ لا دو اس دل میں جو ہیں تیرے دیکھنے والے — سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی

جو دشمن کے لئے بھی اشک سے اپنے کھیل جاتے ہیں — دلِ خوباں میں چبھتا ہے انھیں کا بانکپن ساقی

وہی انساں جسے سرتاج مخلوقات ہونا تھا — وہی خود سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی
کہیں خود حسن رہ جائے نہ قومی ملکیت بن کر — کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدود وطن ساقی
کہاں میں رندِ سرگشتہ کہاں یہ دعوئے تمکیں — سمجھ لے اس کو بھی میرا اک انداز سخن سامی

اسی طرح نظم "گزر جا" کا ہر شعر بصیرت افروز ہے اور ارباب وطن کے لئے ایک خاص پیام ہے :-

ہر عشرت بے وقت و محنت سے گزر جا — جنت بھی میسر ہو تو جنت سے گزر جا
جرأت ہے تو ہر نیم صداقت سے گزر جا — ہمت ہے تو محدود محبت سے گزر جا
کرنا ہے اگر کار نمایاں کوئی تجھ کو، — اٹھ اور ہر آسانی کلفت سے گزر جا

"گاندھی جی" کی موت پر ان کے تاثرات یہ تھے :-

وہی ہے شور ہائے ہو وہی ہجوم مرد و زن — مگر وہ حسن زندگی، مگر وہ جنت وطن
شراب نو کی مستیاں کہ الحفیظ الاماں — مگر وہ اک لطیف سا سرورِ بادۂ کہن
ہزار دو ہزار ہیں اگرچہ رہبران ملک — مگر وہ پیرِ نوجواں، وہ ایک مردِ صف شکن
وہی مہاتما وہی شہیدِ امن و آشتی — پریم جس کی زندگی خلوص جس کا پیرہن
وہی ستارے ہیں مگر کہاں وہ ماہتابِ ہند
وہی ہے انجمن مگر کہاں وہ صدر انجمن

رمز و کنایہ شاعری کی جان ہے اور حضرت جگر کی غزلوں میں اس کی کمی نہیں ہے، مگر بیان کی صداقت بسا اوقات اتنی صفائی اختیار کر لیتی ہے کہ وہ شعر حضرت جگر کے مقام سے گر جاتا ہے۔ یہ کیفیت "کلائیاں توبہ" "جرأت شوق" "اول اول" "تھک جانے کے انداز" اور ایسے اور مقامات میں ہے اور گراں گزرتی ہے اور نظموں میں، "بھاگ ایسی سرزمیں سے بستر لئے ہوئے" یا "ناگ ہیں کالے ناگ" جیسے مصرعے طبع لطیف پر گراں بار ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ اس کا صرف ایک ہی جواب اور وہ یہ کہ حضرت جگر اپنی صاف گوئی سے مجبور ہیں خواہ وہ تجدید ملاقات کا عالم بیان کر رہے ہوں خواہ وہ ابنائے وطن کی بے راہ روی کے شکوے کر رہے ہوں۔

رعایتی اعلان

من و یزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — نگارستان — جمالستان — مکتوبات نیاز تین حصے — حسن کی عیاریاں —
ذہب — فراست الید — مجموعۂ استفسار و جواب جلد سوم — قول فیصل — شہاب کی سرگزشت — نقاب اٹھ جانے کے بعد —
میزان

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

عصرِ جدید کے فلاسفہ

(نواب محمد عباس طالب صفوی)

ازمنۂ وسطیٰ کے فلسفہ کے اختتام اور عصرِ جدید کے فلسفہ کے آغاز کی تاریخ کا تعین بایں معنی دشوار ہے کہ آج تک ازمنۂ وسطیٰ کے عیسائی فلسفی سینٹ ٹامس اکیوناس کے کروروں متبعین بھی موجود ہیں[1]۔ مسلمان فلسفی شیخ الرئیس کے نام لیوا بھی مفقود نہیں، اور ہندو فلسفی شنکر آچاریہ کے ماننے والے بھی ناپید نہیں، یعنی ازمنۂ وسطیٰ کا فلسفہ حقیقتاً اب تک موجود ہے اور ان معنوں میں بھی یہ تعین دشوار ہے کہ عصرِ جدید کو ازمنۂ وسطیٰ سے کب اور کیونکر ممیز کیا جائے؟

مجھے اس سلسلے میں مختلف مباحث کے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور میرے نزدیک پروفیسر رائٹ کی درجِ ذیل تقسیم عصرِ جدید سب سے بہتر ثابت ہوئی:-

(۱) انسی فلسفہ ۱۴۵۳ء سے ۱۶۰۰ء تک
(۲) نیچرل سائنس کا عصر ۱۶۰۰ء سے ۱۶۹۰ء تک
(۳) عصرِ نور ——— ۱۶۹۰ء سے ۱۷۸۱ء تک
(۴) تصوریت کا عصر ۱۷۸۱ء سے ۱۸۳۱ء تک
(۵) زمانۂ حاضر ——— ۱۸۳۱ء سے اب تک[2]

عصرِ جدید کے آغاز اور اس کے ادوار کی تقسیم کی طرح عصرِ جدید کے موثرات کے بارے میں بھی شدید اختلاف ہے۔

پروفیسر ولیم ڈیورال کا یہ خیال ہے کہ محاربات صلیبیہ کی وجہ سے مشرق کا الحاد یورپ میں داخل ہوا[3] حالانکہ اس "الحاد" سے یورپ، اسپین کی فتح سے واقف تھا اور یونان اور رومۃ الکبریٰ کی ثقافت کو ختم کرنے والی نصرانیت اگر کسی ثقافت سے متاثر ہوئی تھی تو صرف اسلامی ثقافت سے اور محاربات صلیبیہ سے صدیوں قبل اسپین کے عیسائی پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی کے الفاظ میں نصرانیت اور اس کی ثقافت سے متنفر ہو کر صحرانشین عربوں کی ثقافت کے پرستار بن چکے تھے[4]۔ یعنی جب کہ یہ امر متحقق ہے کہ یورپ کے عہدِ ظلمت کو اسلامی ثقافت نے منور کیا، عصرِ جدید کے موثرات میں پروفیسر ولیم ڈورال کے علی الرغم اسلامی ثقافت کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔

میری رائے میں ازمنۂ وسطیٰ کو عصرِ جدید کی صورت دینے والا کوئی ایک موثر قرار نہیں دیا جا سکتا اور عصرِ جدید کی تشکیل کو متعدد مذہبی، سیاسی اور علمی موثرات کا رہینِ منت سمجھنا اقرب بصواب ہے۔

---

[1] "A History of Western Philosophy" page 474
[2] "A History of Modern Philosophy" page 9
[3] "The Story of Philosophy" page 105
[4] "عبرت نامۂ اندلس" جلد ثانی مطبوعۂ لاہور صفحات ۴۰۲ — ۴۰۰

ازمنۂ وسطیٰ میں عیسائی مدرسین فلسفہ کو مسخ کرنے کے بعد اُسے بظاہر مذہب کا خدمت گزار بنا چکے تھے لیکن حقیقتہً خود وہ بھی سمجھتے تھے کہ معتقداتِ نصرانیت کو مطابقِ عقل ثابت کرنا آسان کام نہیں ہے اور سینٹ ٹامس اکیوناس کو اعتراف کرنا پڑا تھا کہ تثلیث، حلول اور اولیں گناہ کے عقاید کو عقل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔[1] سینٹ ٹامس کے بعد کے عیسائی فلاسفہ کو اور زیادہ واضح الفاظ میں اعتراف کرنا پڑا کہ نہ نصرانیت کے عقاید کو عقلاً ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ ان عقاید کو واضح الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔[2] تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کے ان اعترافات کا عصرِ جدید پر یہ اثر ہوا کہ اٹلی کی نشاۃ جدیدہ سے اب تک کسی فلسفی نے نصرانیت کے تمام عقاید کو مطابقِ عقل ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔

سیاسی موثرات میں ایک طرف عیسائیوں کے مذہبی پیشوا کا سیاسی زوال اثر پذیر ہوا اور چودھویں صدی عیسوی کی اس عبرت خیز حالت سے کہ بیک وقت دو[3] یا تین[4] اشخاص پوپ ہونے کے مدعی تھے، مذہب کا اقدار ختم ہونے لگا اور دوسری طرف یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قوم کے نام پر وفاق کی صورت اختیار کرنے لگیں اور رفتہ رفتہ قومیت مذہب سے اور حکومت چرچ سے بالاتر سمجھے جانے لگی۔[5]

علمی موثرات میں اہم ترین موثر افلاطون کا فلسفہ تھا جس سے بارِ دگر یورپ کو آشنا کرنے والا ایک یونانی الاصل عیسائی پادری پلیتھو تھا جو ۱۴۳۸ء میں مشرقی اور مغربی چرچ کے وفاق کی شرکت کے لئے فلورنس آیا تھا اور جس نے اٹلی والوں کے اصرار سے مجبور ہو کر فلورنس میں توطن اختیار کر لیا تھا اور ۱۴۴۰ء میں افلاطون کے فلسفہ کی تعلیم و تدریس کے لئے فلورنس میں ایک اکاڈمی کی بنیاد قایم کی تھی۔ پلیتھو عیسائی ہونے کے باوجود یونانیت کا اتنا دلدادہ تھا کہ اس نے نو افلاطونیت کے پردے میں یونان کے قدیم مذاہب کے احیاء کی بھی کوشش کی۔[6]

یورپ والوں کو یونان کے صحیح فلسفے سے واقف ہونے کا ایک اور موقع بہت جلد حاصل ہو گیا۔ یعنی فلورنس کی اکادمی کے قیام کے صرف تیرہ برس بعد سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کر لیا اور جو صاحبانِ علم و فضل قسطنطنیہ سے فرار ہونے کے بعد اٹلی وغیرہ میں اقامت پذیر ہوئے ان کے ذریعے سے یورپ والے لاطینی تراجم کے بجائے براہ راست یونانی افکار سے واقف ہوئے اور انھیں نہ صرف افلاطون۔ فلاطینس وغیرہما کے تصانیف پر دسترس حاصل ہوئی بلکہ ارسطو کے افکار پر سے بھی عیسائی مدرسیت کا پردہ ہٹ گیا اور پروفیسر ویبر کے الفاظ میں یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ ارسطو کا فلسفہ جسے نصرانیت کا عظیم ترین موید سمجھا جاتا تھا حقیقتہً نصرانیت کے بنیادی عقاید کا مخالف تھا۔[7]

چونکہ ان مذہبی، سیاسی اور علمی موثرات کا محور اٹلی تھا، بنابریں شمالی یورپ کے مقابلہ میں اٹلی میں نشاۃ جدیدہ کا آغاز بہت پہلے ہو گیا۔[8] لیکن پندرھویں صدی عیسوی کی اس نشاۃ جدیدہ نے کوئی قابلِ ذکر فلسفی یا کوئی خاص فلسفہ پیدا نہیں کیا اور

---

[1] "A History of Philosophy" By Thilly page 227
[2] Ibid page 247
[3] "A History of western Philosophy" page 505
[4] "A History of Philosophy" By Thilly page 254
[5] "A History of Philosophy" By Webb page 106
[6] "A History of Philosophy" By Thilly page 263
[7] "History of Philosophy" By Weber page 213
[8] "A History of western Philosophy" page 533

پروفیسر برٹرنڈ رسل کے الفاظ میں نشاۃ جدیدہ کے علمبردار چرچ سے آزاد ہو کر یونانی فلسفہ کے بجائے یونانی خرافات میں پھنس گئے لیکن ان الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ نشاۃ جدیدہ کے علم برداروں نے نجوم اور جادو ٹونے کی تحقیق کے علاوہ کوئی اور علمی خدمت انجام نہیں دی اور اگر نشاۃ جدیدہ کے بے نظیر فنِ تعمیر مصوری اور شاعری سے صرفِ نظر ہو جب بھی خود پروفیسر برٹرنڈ رسل کے الفاظ میں یہ تو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ نشاۃ جدیدہ نے انسانی ذہن کو ازمنۂ وسطیٰ کی تنگ نظری سے آزاد کیا اور اگرچہ نشاۃ جدیدہ قدیم یونانی علوم کی حلقہ بگوش رہی تاہم اُس نے قدامت کے مخالف نظریات کے اظہار میں بخل سے کام نہیں لیا۔[1]

نشاۃ جدیدہ کے انسی فلسفہ کا اختتام اور نیچرل سائنس کے عصر کا آغاز ۱۶۰۰ء سے تسلیم کیا جاتا ہے۔[3] اور اس عصر کے موثرات میں پروٹسٹنٹ فرقے کے بانی مارٹن لوتھر کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔[4]

مجھے مارٹن لوتھر کی مذہبی اہمیت سے انکار نہیں ہے اور میں مانتا ہوں کہ جب کہ نشاۃ جدیدہ کے علمبرداروں نے رومن کیتھولک چرچ کے ظواہر و رواسم کے انکار کے باوجود چرچ کے اقتدارِ اعلیٰ سے کبھی بھی انکار نہیں کیا، مارٹن لوتھر نے رومن کیتھولک چرچ کے خود اس اقتدارِ اعلیٰ سے انکار کیا، لیکن رومن کیتھولک چرچ سے انحراف کے یہ معنی سمجھنا کہ مارٹن لوتھر کوئی ایسا روشن خیال انسان تھا جو معتقدات پر سائنس کے انکشافات کو ترجیح دیتا تھا قطعاً غلط ہوگا۔

چونکہ مارٹن لوتھر مذہب اسرار سے بھی متاثر تھا اور قدیم نصرانیت سے بھی بنا بریں پروٹسٹنٹ مذہب کا قیام حقیقتہً جنوبی یورپ کے عیسائی مدرسین کے نظامِ عقلی کے خلاف شمالی یورپ کے اہلِ دل کی بغاوت کے مترادف تھا اور خود مارٹن لوتھر نے نہ صرف یہ اعتراف کیا تھا حسن و قبح شرعی ہے نہ کہ عقلی بلکہ عیسائی مدرسین اور یونانی فلسفہ کے تنفر کے ساتھ ساتھ لوتھر کو سائنس کے انکشافات سے بھی اتنی نفرت تھی کہ جب اُس کو کوپرنیکس کو صرف اس بنا پر نو آموز اور بے وقوف قرار دیا کہ مقدس بائبل کی رو سے زمین ساکن ہے۔[2]

میری قطعی رائے یہ ہے کہ نیچرل سائنس کے عصر کے فلسفہ کے آغاز کا اہم موثر وہ علمی انکشاف تھا جو کوپرنیکس نے سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں کیا اور جس طرح اس سے تقریباً دو ہزار برس قبل اس وقت کے علم ہیئت کا یہ انکشاف فلسفۂ یونان پر اثر انداز ہوا تھا کہ زمین مرکزِ کائنات ہے اور ساکن ہے۔[5] اسی طرح کوپرنیکس کا یہ انکشاف کہ زمین متحرک ہے اور مرکزِ کائنات نہیں ہے سولھویں صدی عیسوی کے انسی فلسفہ پر یقیناً اثر انداز ہوا۔

کوپرنیکس (۱۵۴۳-۱۴۷۳ء) کے بعد کیپلر (۱۶۳۰-۱۵۷۱ء) نے ثوابت کے محور کے نظریہ کو عام کر کے پروفیسر ٹلی کے الفاظ میں نجوم کو باقاعدہ طور سے ہیئت کا علم بنایا۔[6] گلیلیو (۱۶۴۲-۱۵۶۴ء) نے نہ صرف ہیئت میں اہم انکشافات کئے بلکہ اوپر سے چھوٹے اور بڑے پتھر کو ایک ساتھ پھینک کر فلاسفۂ یونان کے اس نظریہ کو کہ بڑی چیز چھوٹی چیز سے قبل سطحِ ارض تک پہونچتی ہے عملاً باطل کیا اور اس طرح نہ محض تجربہ پسند فلسفہ

۱۔ "A History of western Philosophy" page 523
۲۔ حوالۂ سابق
۳۔ "A History of Modern Philosophy" page 9
۴۔ "History of Philosophy" By Weber page 220
۵۔ "A History of Philosophy" By Thilly page 278
۶۔ "A History of western Philosophy page 550
۷۔ "A History of western Philosophy"
۸۔ "A History of Philosophy" page 269

کی بنیاد پڑی بلکہ نیوٹن کے کششِ ارض کے مسئلہ کی بھی داغ بیل پڑی[1] اور گلیلیو کی طرح کیپلر (۱۶۳۱-۱۵۷۱ء) کے حرکاتِ سیّار کے قواعد بھی نیوٹن کے نظریۂ کششِ ارض کے موثرات میں شامل کئے جاسکتے ہیں[2]

یہ تینوں سائنس داں جنوبی یورپ کے باشندے تھے اور ان تینوں کی طرح امریکہ کو دریافت کرنے والا واسکوڈی گاما بھی جنوبی یورپ کا رہنے والا تھا لیکن جنوبی یورپ میں رومن کیتھولک چرچ کے اقتدار کی وجہ سے سائنس کی وہ ناقدری تھی کہ صرف اس جرم میں کہ گلیلیو کی دوربین سے آفتاب میں داغ دکھائی دیتے تھے اور آفتاب کے داغ معاذ اللہ خالق کی تخلیق کے نقص پر دلالت کرتے تھے، گلیلیو کو اپنے اہل و عیال سے علیحدہ رہنے پر مجبور کیا گیا اور محض اس خطا پر کہ کوپرنیکس کے نظریۂ حرکتِ ارض کی وجہ سے کرۂ ارض کی اہمیت اور حق تعالیٰ عزّ اسمہ کا جناب عیسیٰ کی شکل میں متشکل ہونے کا عقیدہ باطل ہوتا تھا، گلیلیو کی طرح کوپرنیکس کے تصانیف کا پڑھنا بھی جرم قرار دیا گیا[3] اور پروفیسر برٹرنڈ رسل کے الفاظ میں رومن کیتھولک چرچ کی اس دشمنی کی وجہ سے جنوبی یورپ میں سائنس کا چراغ بارِ دگر صدیوں تک نہ روشن ہوسکا[4]

شمالی یورپ کے پروٹسٹنٹ ممالک کے حالات مقابلتاً سازگار تھے لیکن اس سازگاری کی وجہ یہ نہیں تھی کہ پروٹسٹنٹ مذہب کے عالمانِ دین رومن کیتھولک مذہب کے پیشواؤں سے زیادہ روشن خیال تھے۔ پروٹسٹنٹ مذہب کے بانی مارٹن لوتھر کی سائنس دشمنی کا حال اس سے قبل سپردِ قلم کیا جاچکا ہے اور لوتھر کی سائنس دشمنی کا یہ اثر ہوا کہ ۱۸۷۳ء میں امریکن لوتھیرن چرچ پریس سیمی ناری کے صدر کے حرکتِ ارض کے خلاف کتاب تحریر کرنے تک پروٹسٹنٹ مذہب کے پادریوں نے ہر عصر میں سائنس کی مخالفت کی[5]۔ لیکن چونکہ پروٹسٹنٹ مذہب کے قیام کی بنیاد پوپ اور پادریوں کے اقتدار کے خلاف احتجاج پر مبنی تھی بنا بریں کسی پروٹسٹنٹ ملک میں خود پروٹسٹنٹ پادریوں کو سلطنت کے مقابلہ میں کبھی بھی کوئی اقتدار حاصل نہیں ہوسکا اور جبکہ رومن کیتھولک ممالک کے محکمۂ احتساب نے ایک کروڑ انسانوں کو الحاد کے جرم میں موت کی سزا دی[6] اور برنو ایسے سائنسداں کو آگ میں جلا دیا[7]۔ پروٹسٹنٹ پادری محض زبانی طور سے سائنس کی مخالفت کرتے رہے اور سائنس دانوں کی مخالفت میں کوئی عملی اقدام نہ کرسکے۔

پروٹسٹنٹ پادریوں کی اس بے بسی کا یہ خوشگوار نتیجہ برآمد ہوا کہ اٹلی کی نشاۃ جدیدہ کے اختتام کے بعد شمالی یورپ کی بارآور نشاۃ جدیدہ کا آغاز جس داعل میں ہوا اس میں مذہبی مخالفت کا عنصر نظر انداز کرنے کے قابل تھا اور رانسی فلسفے کے عصر کے بعد جو پروفیسر برٹرنڈ رسل کے الفاظ میں کوئی ایک قابلِ ذکر فلسفی بھی نہ پیدا کرسکا۔ شہنشاہ سائنس کے فلسفہ کے دور میں جو قابلِ ذکر فلاسفہ پیدا ہوئے وہ یا تو پروٹسٹنٹ ممالک کے باشندے تھے اور یا پھر سترھویں صدی عیسوی کے مشہور فلسفی دے کارے کی طرح پروٹسٹنٹ ممالک میں پناہ گزیں ہوگئے تھے[8]۔ اور رومن کیتھولک چرچ کے تشدد کا نتیجہ نکلا کہ نشاۃ جدیدہ سے اب تک جنوبی یورپ کے کسی ملک میں کوئی ایسا فلسفی پیدا نہیں ہوا جس کے نظریات بین الاقوامی شہرت کے حامل ہوں۔

---

1. "A History of Western Philosophy" pages 553—55
2. "A History of Philosophy" By T. Hilly page 270
3. "Religion & Science" By Russell pages 31—41
4. "A History of Western Philosophy" page .
5. "Religion & Science" pages 42—43
6. "A Rationalist Encyclopaedia" page 320
7. Ibid page 235
8. "A History of Western Philosophy" page 525
9. "Religion & Science" page 42

قرۃ العین

سرزمین ایران کی قلوبطرہ

(پروفیسر عصمت اللہ جاوید - امراؤتی)

مسلک بابی کی حسین وجمیل ہیروین قرۃ العین کا نام تاریخ مذہب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نیا نہیں - اردو کے جواں مرگ رومانوی انشا پرداز سجاد انصاری کو قیامت کا صرف اس لئے انتظار تھا کہ وہ قرۃ العین کے قاتلوں کا حشر دیکھنا چاہتے تھے۔
ایران میں طریق بابیہ کی اشاعت وتبلیغ میں منجملہ دیگر اسباب کے، قرۃ العین کے حسن وجمال، اس کے پر اثر استدلال، اسکی ذہانت اور سب سے زیادہ اس کی والہانہ شیفتگی کا بہت بڑا ہاتھ تھا، اس کی یہ شیفتگی جنون کی حد تک پہونچ گئی اور آخر کار اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

آلوسی مفتی بغداد قرۃ العین کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

"مانند او احدے از رجال در فضل وکمال ندیدہ ام - میرزا مہدی خاں زعیم الدولہ کہ کتاب مفتاح باب الابواب را در رد بابیہ نوشتہ ہنگامیکہ قلمش بر سر نام قرۃ العین میرسد از تجلیل وستایش خود داری نمی کند"۔

ہم خواہ اس کے عقاید سے متفق نہ ہوں، خواہ اس کے اخلاق پر تہمت لگائیں لیکن اس کی انفرادی وشخصی عظمت سے انکار نہیں کرسکتے - ایران کی یہ حسین وجمیل ساحرہ سخنور بھی تھی اور طاہرہ اس کا تخلص تھا۔
سرزمین عجم سے متعدد فتنے اٹھے - مزدک، ابو مسلم خراسانی، ہاشم بن حکیم المقنع بہ آفرید، سند باد مجوسی، ابن المقفع استاذ سیسو، جاماسپ، بابک خرمی، افشین، اور حسن بن صباح انھیں میں ایک بابیوں اور بہائیوں کا بھی مسلک تھا۔
طاہرۂ عجم کی ان افسانہ خیز شخصیتوں کی طویل فہرست میں قرۃ العین صف اول میں جگہ پانے کی مستحق ہے، بلکہ اس کا نام ہیلن، سیفو، قلوبطرہ اور میری انٹونیٹ کے ساتھ لینا چاہئے جن کے حسن کی سحر کاریوں اور ذہانت کے واقعات سے تاریخ عالم کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔

قرۃ العین کا نام فاطمہ ہے، کنیت ام سلمہ اور لقب زکیہ - مدیر آژنگ ہفتہ وار نے اس کا نام زریں تاج خانم لکھا ہے۔ وہ شیعی اخباری علماء کے ایک شریف مذہبی گھرانے میں بمقام قزوین ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئی - اس کے والد کا نام ملا صالح برغانی تھا - ملا صالح کے دو بھائی ملا محمد تقی اور ملا محمد علی ایران بھر میں اپنے علم وفضل کے لئے مشہور ومعروف تھے اور فتح علی شاہ قاچار کے زمانہ سے قزوین میں جاگزیں تھے - قرۃ العین کے مذہبی رجحان کو (جس نے آگے چل کر جنون کی شکل اختیار کرلی تھی) سمجھنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی اور اس کے خاندان کی مذہبی فضا کا سرسری طور پر جایزہ لیا جائے۔

اس زمانہ میں شیخ احمد احسائی کے ہاتھوں فرقۂ شیخی کی بنیاد پڑ چکی تھی - شیخ احمد احسائی، ملا صدرالدین محمد ابراہیم کا (جو ملا صدرا کے نام سے مشہور ہے) شاگرد تھا، یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ سرزمین ایران میں اسلام کی آمد کے بعد سامی اور آریائی ذہنیتوں کے

ارتباط سے ایک نئی ذہنی نسل پیدا ہوگئی تھی جس نے ایک طرف زبردست علماء دین اور فلاسفہ پیدا کئے اور دوسری طرف الوہیت، نبوت اور امامت کے مدعیوں کو بھی پیدا کیا۔

حضرت علی کی زندگی ہی میں ایک یہودی نومسلم کے ہاتھوں جو حضرت علی کی ربوبیت کا بیج بویا گیا تھا اسے سرزمین ایران میں فرقۂ نصیریہ کی شکل میں پھولنے پھلنے کا موقع ملا۔ تناسخ، حلول اور رجعت، آریائی نسل کے محبوب عقاید ہیں، راوندیہ اور باطنیہ کے اساس بھی اسی عقیدۂ تناسخ پر تھی۔ شیخ احمد احسائی نے بھی "جسم ہورقلیائی" کا عقیدہ پیش کیا جو ایرانیوں کے لئے نیا نہیں تھا۔ اس لئے کہ اسکی بنیاد بھی تناسخ پر قایم ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے مرنے کے بعد انسان کے افکار اور کردار کی ممتاز خصوصیات ایک روحانی دنیا میں برقرار رہتی ہیں اور روح وہاں اس موقع کی منتظر رہتی کہ کوئی مناسب مادی جسم ملے تاکہ وہ اس میں حلول کرکے دوبارہ دنیا میں آئے۔ ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اس وقت ایران میں امام معہود کا عقیدہ شیعہ مذہب کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا تھا اور شیعہ حضرات بارھویں امام کے ظہور کے شدت سے منتظر تھے۔ اسی ماحول اور اسی فضا میں شیخ احمد احسائی نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ وہ امام مہدی کی آمد کے لئے درمیانی واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب فاطمہ کے خاندان کی مذہبی فضا کی طرف آیئے۔ فاطمہ کے چچا جو آگے چل کر اس کا خسر بنا) ملا محمد تقی نے شیخ احمد احسائی کے عقاید کو اسلامی عقاید کے منافی قرار دے کر اسے کافر ٹھہرایا تھا۔ ملا محمد تقی اور اس کے بھائیوں نے دو دینی مدرسے بھی قایم کئے تھے۔ ایک عام طلبہ کے لئے اور دوسرا اپنے ہی خاندان کے لئے جو مدرسہ اس خاندان کے لئے مخصوص تھا اس میں اس خاندان کے افراد کے درمیان مذہبی مباحثے ہوا کرتے تھے۔ فاطمہ بھی جو آگے چل کر قرۃ العین کے نام سے مشہور ہوئی، ان مباحث میں شریک ہوا کرتی تھی۔ اس طرح اس نے بہت جلد علوم دینی میں دستگاہ حاصل کرلی۔ وہ بچپن ہی سے اصطلاحات دینی اور احادیث و اخبار میں دلچسپی لینے لگی تھی اور ان میں مہارت تامہ حاصل کرلی تھی۔ پاس پڑوس والے بھی اس کی حیرت انگیز قابلیت سے متاثر تھے، یہاں تک کہ کچھ عورتیں بھی مذہبی و فقہی مسایل میں اس سے مشورہ کرنے لگیں۔

ملا محمد تقی جیسا کہ کہا جاچکا ہے شیخی جماعت سے دشمنی مول لے چکا تھا۔ لیکن خود فاطمہ کا باپ ملا صالح مرنجان و مرنج انسان تھا۔ اپنے مذہبی "تعصب" کے باوجود شیخیوں کے خلاف دشمنی کا اعلان نہیں کیا بلکہ وہ اس ہنگامۂ دار و گیر سے دور ہی رہا اور اپنی زندگی کربلا میں گزار دی۔ لیکن فاطمہ کا چھوٹا چچا یعنی ملا محمد علی، شیخ احمد احسائی سے کافی متاثر تھا، بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ شیخی عقاید کی دعوت و تبلیغ کے لئے اس سے اجازت بھی طلب کی تھی۔

فاطمہ کی ذہنی نشوونما ایسے مذہبی ماحول میں ہوئی جس میں دو عناصر کام کر رہے تھے، ایک امام غائب کے ظہور کا صریح وعدہ تھا اور دوسرے اس کا حقیقی ظہور۔ گو فاطمہ فطرت سے ذہین و قادر لے کر آئی تھی، لیکن اس کا رجحان مذہبی سے زیادہ شاعرانہ تھا۔ وہ اپنے خواب ٹھوس شکل میں دیکھنے کے لئے بے قرار تھی۔ ملا محمد علی کے عقاید نے اس کی افتاد طبیعت کی پشت پناہی کی اور اس نے اپنے چچا کے توسط سے شیخیوں کے عقاید میں دلچسپی لینی شروع کی۔

۱۸۲۸ء میں شیخ احمد احسائی کا انتقال ہوچکا تھا اس کے بعد اس کا شاگرد سید کاظم رشتی شیخیوں کا سالار کارواں بنا۔ فاطمہ نے سید کاظم رشتی سے خط و کتابت شروع کی اور شیخی عقاید کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ سید کاظم نے فاطمہ کے طرز نگارش اور اس کے سوالات کی نوعیت سے اس کی ذہانت اور تبحر علمی کا اندازہ لگالیا اور ازراہ تشویق اپنے خطوں میں اسے "یا قرۃ العین" (اے آنکھ کی ٹھنڈک) کہکر مخاطب کرنا شروع کیا اور اس طرح فاطمہ، قرۃ العین کے نام سے مشہور ہوگئی۔

جیسا کہ کہا جاچکا ہے، بچپن ہی سے قرۃ العین میں ذہانت کے آثار پائے جاتے تھے۔ ملا محمد تقی نے اپنی بھتیجی کی ذہانت و جمال سے متاثر ہوکر اسے اپنے بیٹے ملا محمد کے لئے انتخاب کیا اور قرۃ العین، ملا محمد کی زوجیت میں آگئی۔ اس سے قرۃ العین کے تین بچے ہوئے۔ دو لڑکے

اور ایک لڑکی۔

قرۃ العین اصول شیخی سے رفتہ رفتہ اس قدر متاثر ہوئی کہ اب اس کے لئے خاموش رہنا مشکل ہوگیا اور وہ گھر والوں کے سامنے اس عقیدہ کا اظہار کرنے لگی، چونکہ اس کے اور اس کے شوہر و خسر کے عقاید میں اختلاف تھا اس لئے آئے دن گھر میں تو تو میں میں ہونے لگی، رفتہ رفتہ نوبت مار پیٹ تک پہونچی۔

اس تشدد نے قرۃ العین کے ذہن میں زبردست ردّ عمل پیدا کیا اور وہ اپنے شوہر حتیٰ کہ اپنے بچے چھوڑ کر میکہ آ رہی۔ اس زمانہ میں سید کاظم رشتی کربلا میں تھا اور خود کو امام مہدی کا درمیانی واسطہ ظاہر کر چکا تھا۔ اتفاق کی بات کہ گھر والوں نے جو قرۃ العین کے عقاید سے پریشان تھے یہ تجویز پیش کی کہ اسے عتبات عالیہ کی زیارت کے لئے بھیجا جائے۔ انھوں نے یہ سوچا تھا کہ شاید سیر و تفریح سے اس کے جنون میں کچھ کمی آجائے گی۔ جب قرۃ العین کربلا پہونچی تو سید کاظم کا انتقال ہو چکا تھا۔ سید کاظم کی بیوی نے اس کی آؤ بھگت کی۔ اس کے بعد قرۃ العین نے اپنے استاد معنوی کے گھر ہی میں قیام کیا اور اپنے میکے واپس جانے سے انکار کر دیا۔

سید کاظم رشتی کی وفات کے بعد اس کے متبعین اطراف و جوانب میں باصطلاح خود کسی "شمس حقیقت" کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے جو سید کاظم کا جانشین ہو۔ انہی میں ایک شخص ملا حسین بشرویہ تھا۔ قرۃ العین نے ملا حسین سے بذریعہ خط درخواست کی تھی کہ اگر شاید مقصود ہاتھ لگے تو مجھے اس کی اطلاع ضرور دینا۔ اسی زمانہ میں سید علی محمد باب نے جو کربلا میں سید کاظم کی تقریریں سن چکا تھا، شیراز میں ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء کو یہ دعویٰ کیا کہ میں خود وہ واسطہ ہوں جس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ بعض شیخیوں کی طرح ملا حسین بشرویہ نے بھی اسے "شمس حقیقت" یا قرۃ العین کے الفاظ میں 'شاید مقصود' سمجھ لیا اور اسے قرۃ العین کا خط بھی دکھایا۔ اس کے بعد باب نے قرۃ العین کو ایک خط لکھا۔ اس خط نے تازیانے کا کام کیا اور قرۃ العین نے جو ذہنی طور پر اس صورت حال کی بے قراری سے منتظر تھی۔ باب میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھی، غالباً اسی زمانہ میں اس نے ظہور باب دو قصیدے لکھے جن کے بعض اشعار یہ ہیں:-

بدیار عشق تو اندہ ام ز کسی ندیدہ عنایتی — بفریبم بنما نظر تو کہ بادشاہِ ولایتی
شمس انبی جلوہ گر کہ دید جان عاشقاں — در ہوائی طلعتش چوں ذرہ رقصاں آمدہ

اس کے بعد باب کی تعریف میں اس نے کئی اشعار لکھے، چونکہ باب نے اسے طاہرہ کے لقب سے سرفراز کیا تھا اس لئے اس نے اپنے لئے طاہرہ تخلص تجویز کیا۔ اس سلسلہ میں ایک ترکیب بند بعنوان "سرنوشت من" کے چند بند ملاحظہ کیجئے:-

اے ز سر زلفِ تو سودائی من — وز غم ہجراں تو غوغائی من
لعل لبت شہد مصفائی من — عشق تو بگرفت سراپائی من
من شدہ تو آمدہ برجائی من

گرچہ بسے رنج غمت بردہ ام — جام پیاپے ز بلا خوردہ ام
سوختہ جانم اگر افسردہ ام — زندہ دلم گرچہ ز غم مردہ ام
چوں لب تو ہست مسیحائے من

گنج منم، بانیٔ مخزن توئی، — سیم منم صاحب معدن توئی،
دانہ منم، صاحب خرمن توئی — ہیکل من چیست اگر من توئی
گر تو منی چیست ہیولائے من

اسی نظم کے ایک بند کے دو آخری مصرعے یہ ہیں:-

تا تو منی، من شدہ ام خود پرست — سجدہ گہہ من شدہ اعضائے من

بابیوں کے شوقِ شہادت کی تصویر اس بند میں دیکھئے :-

عشق بہر لحظہ ندا میکند — بر ہمہ موجودہ صدا میکند
ہر کہ ہوائے رہ ما می کند — گر حذر از موجِ بلا میکند
پا ننہد بر لبِ دریائے من[1]

سید علی محمد باب کے داعی محمد علی بسطامی سے ملاقات کے بعد قرۃ العین نے علی الاعلان بابی مسلک کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس سے مسلمانانِ کربلا میں کافی ہیجان پیدا ہوا اور ایک رات انھوں نے سید کاظم کے مکان پر جس میں قرۃ العین بھی فروکش تھی، پتھراؤ کیا۔ عراق کے عامل اعلیٰ نے کشت وخون سے بچنے کے لئے قرۃ العین کو کربلا سے بغداد بھیج دیا۔ بغداد میں قرۃ العین، شیخ محمد شبل کے گھر گئی اور چونکہ یہاں بھی اس نے تبلیغ جاری رکھی اس لئے اسے سرکاری طور پر محمود آفندی کے مکان میں رہنے پر مجبور کیا گیا۔ وہ بادل ناخواستہ ملا حسین بشرویہ کی ماں، بہن اور اپنے چند ہم مشربوں کے ساتھ اس مکان میں اٹھ آئی۔

قرۃ العین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے عقاید میں سید باب سے بھی دو قدم آگے تھی اور عوام باب اور اس کے پیروؤں کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ پھر چونکہ اصول شیخی کے مطابق شیعۂ کامل (بابی خود کو شیعہ کامل گردانتے تھے) کو گالی دینے والا کافر ہے، اس لئے قرۃ العین نے بطور ردعمل اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ عام لوگوں سے سودا نہ کریں اور ان کے ہاتھ کی کوئی چیز نہ کھائیں، پھر آگے چل کر اس نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ حضرت فاطمہ الزہرا کا مظہر ہے، چونکہ بابیوں کا مقاطعہ عام مسلمین سے ناقابل عمل تھا اس لئے قرۃ العین نے اپنے پیروؤں کو اجازت دی کہ وہ عام لوگوں سے چیزیں ضرور خرید سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ چیزیں خرید کر پہلے اس کے سامنے لایا کریں تاکہ وہ ان چیزوں پر نگاہ ڈال کر انھیں پاک کر دے۔

اس نے بغداد میں مکمل طور پر پردہ تو ترک نہیں کیا البتہ وہ اپنے خاص خاص مریدوں کے سامنے بے پردہ آنے لگی۔ جب اس کی شدت سے مخالفت ہوئی تو وہ اپنے عام مریدوں کے سامنے بھی آنے لگی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

مدیر آرٹنگ لکھتے ہیں :-

"قرۃ العین زنے است کہ در ایران ظلمانی صد واند سال پیش (سو سال سے کچھ پہلے) رفع حجاب کرد... مورخین بے طرف (یعنی غیر جانبدار) اقدام متہورانۂ قرۃ العین را در رفع حجاب وظہورش را در جلسات رجال ستودہ اند"۔

کچھ لوگوں نے اس کی بے پردگی کو پسند نہیں کیا اور اس کے دلایل کو غیر تشفی بخش سمجھ کر سید علی باب سے رجوع کیا۔ انھوں نے ایک خط سید کاظم رشتی کے ایک قرابت دار کے ہاتھ باب کے نام بھیجا۔ یہ خط باب کو ماکو میں جہاں وہ قید تھا ملا اور وہیں سے اس نے جواب میں قرۃ العین کے اقدام کو سراہا اور اس کے مخالفین کو سخت سست کہا۔ یہ خط پڑھ کر کچھ لوگ، تو طریق بابیہ ہی سے کنارہ کش ہو گئے لیکن اکثر کے دلوں میں قرۃ العین کی عزت دوبالا ہو گئی۔

چونکہ بغداد میں قرۃ العین سنی و شیعی علما سے مسلسل مناظرے کیا کرتی تھی۔ اس لئے اس کے خلاف علماء و جمہور نے صدائے احتجاج بلند کی اور آخر کار اسے سرزمین عراق سے ایران روانہ کر دیا گیا۔ وہ کرمان شاہ پہونچی۔ وہاں بھی اس نے دعوت وہاں بھی اس نے دعوت و تبلیغ جاری رکھی جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں میں بھی کافی ہیجان پھیل گیا۔ انجام کار قرۃ العین کے رشتہ داروں نے حکومت کے سپاہیوں کی مدد سے اسے راتوں رات کرمان شاہ سے ہمدان پہونچایا۔ یہاں بھی کافی شور و غوغا ہوا اس لئے اس کے بھائی اسے قزوین لے آئے۔ جب قرۃ العین، قزوین لوٹی تو لوگوں میں کافی جوش و خروش تھا، اکثر لوگوں نے اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا

---

[1] اس بند میں شتر گربہ ہے لیکن حافظ کا یہ مشہور شعر "اگر آں ترک شیرازی" بھی اس سے بری نہیں۔

کچھ لوگ اس پر فریفتہ ہو گئے اور اس کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہوا۔

قرۃ العین کا خسر حاجی محمد تقی اپنی بھتیجی کی بدنامی اور اسلامی عقاید کی پامالی برداشت نہ کر سکا، چونکہ اس کی نظر میں اس فتنہ کی جڑ شیخ احمد احسائی، سید کاظم رشتی اور سید علی محمد باب تھے اس لئے اس نے ان پر کافی زور شور سے حملے کئے۔ اس نے قرآن و احادیث کی روشنی میں اپنی بھتیجی سے تبادلۂ خیالات بھی کیا اور اسے ان گمراہ کن عقاید سے باز رہنے اور اپنے بیٹے ملا محمد کے گھر واپس چلنے کے لئے کہا لیکن قرۃ العین نے ایک نہ مانی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ حاجی محمد تقی، شیخ احمد احسائی، سید کاظم رشتی اور سید باب جیسے شیعیان کامل کو برا بھلا کہتا ہے، اس لئے وہ کافر ہے اور اس کی ایک کافر سے کسی صورت میں نہیں بن سکتی۔

ایک دن کچھ لوگ سید باب کے کسی نئے پیرو کو پکڑ کر ملا محمد تقی کے سامنے لائے تو اس نے اس کو کافی زدوکوب کیا۔ اس واقعہ سے پیروانِ باب میں کافی اشتعال پیدا ہوا اور انھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ ملا محمد تقی کا کام تمام کر دیں گے۔ اس واقعہ کے پندرہ روز بعد باب کے ایک متعصب پیرو سید صالح شیرازی نے ۱۸۴۷ء میں ملا کا سر نیزے سے زخمی کر دیا اور ایک وار منہ پر کیا جس سے زبان پھٹ گئی، ملا اس حملہ سے جانبر نہ ہو سکا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ قتل قرۃ العین کی شہ پر ہوا تھا۔ اس لئے اس کے خلاف کافی اشتعال پھیل گیا، اور انھوں نے حکومتِ وقت پر دباؤ ڈالا کہ قاتلوں کو سزا دی جائے، چنانچہ ملزمین کو نظر بند کیا گیا، سید صالح شیرازی نے اقبالِ جرم کیا۔ مزید تحقیقات ہوئی اور چھ ملزمین کو گرفتار کر کے طہران بھیجا گیا۔

ملا محمد اپنی بیوی قرۃ العین کے خون کا پیاسا تھا، اس لئے قرۃ العین نے باب کے ایک جانثار پیرو میرزا حسین علی نوری کو خط لکھا اور اس سے مدد مانگی۔ میرزا حسین علی نے میرزا ہادی علی کو مدد کے لئے بھیجا جو قرۃ العین کو اس کی پناہ گاہ سے کسی نہ کسی طرح نکال لایا اور دور کے پر پیچ راستہ سے اندرماں پہونچا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پیشوایانِ باب نے شاہرود کے قریب بدشت میں ڈیرہ ڈالا اور دو چھاؤنیاں ایک اپنی اور دوسری قرۃ العین اور میرزا حسین علی نوری کی سرپرستی میں قایم کی گئیں۔ اس کے بعد بابیوں نے سید باب کو ماکو کے قید خانے سے چھڑانے کی کوشش کی ناکام ہوئے اور روس کی سرحد میں بھاگ کر پناہ لی۔

بابیوں کو جب بھی کوئی عملی مشکل پیش آتی یا کوئی پیچیدہ مسئلہ سامنے آتا تو قرۃ العین اس کی گرہ کشائی کرتی اور نئی تجویزیں پیش کرتی، ایک دن کچھ پیروانِ باب اس سے مشورہ طلب کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے۔ قرۃ العین اس دن بہترین لباس زیب تن کئے ہوئے تھی اور پردہ کے پیچھے سے اپنے منصوبوں کا جایزہ لے رہی تھی۔ ناگہاں اس کے اشارۂ ابرو سے پردہ ہٹا دیا گیا اور وہ ایک افسانوی ہیروین کی طرح سامنے آگئی۔ کچھ لوگوں نے تو ہاتھوں سے چہرے ڈھانپ لئے۔ کچھ لوگ بھاگ گئے لیکن چند افراد وہیں جمے رہے اور ان پر چند لمحوں تک "چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من"۔ کی کیفیت طاری رہی۔

قرۃ العین نے انھیں اور زیادہ فریفتہ کرنے کے لئے غمزہ و ناز سے بھی کام لیا۔ ملا حسین نوری نے یہ حالت دیکھ کر اس نے اپنی عبا اس کے کندھوں پر ڈال دی اور باہر لے گیا۔ اس منظر کا تصور کر کے آپ قرۃ العین کے یہ اشعار پڑھئے اور تھوڑی دیر کے لئے فرض کیجئے کہ قرۃ العین نے یہی اشعار اس وقت سامعین کے سامنے پڑھے تھے:-

اگر بباد دہم زلف عنبر آسا را	اسیر خویش کنم آہوانِ صحرا را
دگر بنرگسِ شہلائے خویش سرمہ کشم	بروز تیرہ نشانم تمام دنیا را
برائے دیدن رویم سپہر ہر دم صبح	بروں برآورد آئینۂ مطلا را
گزار من بکلیسا اگر فتد روزے	بدیں خویش برم دخترانِ ترسا را

کچھ لوگ ملا محمد قدوس کے پاس پہونچے اور اس کے سامنے اس واقعہ کی مذمت کی۔ یوں تو باب نے قرۃ العین کو بے پردگی کی

اجازت دے دی گئی تھی لیکن ملا محمد قدوس نے دلوں میں کچھ شکوک پیدا کر دئے - جب قرۃ العین کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی نگاہ کا تیر قدوس پر بھی آزمانا چاہا - اس نے اپنے دو وفادار ساتھیوں کو قدوس کے پاس بھیجا، انھوں نے قدوس سے کہا:- "آپ قرۃ العین کو خواہ مخواہ برا بھلا کہتے ہیں - آپ ان سے ملئے اور مناظرہ کیجئے - ہارنے والا جیتنے والے کی پیروی کرے گا، اگر آپ نہیں مانیں گے تو ہم یہاں سے ٹلنے والے نہیں ہیں، چاہے آپ ہمیں جان سے کیوں نہ مار ڈالیں"۔

آخر کار رفع شر کے خیال سے یہ طے پایا کہ قدوس، قرۃ العین سے ملے، اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا بہ مقابل ایک "تیغ غمزہ زن" ہے، جس کے پاس دام گیسو، تیر نگاہ اور شمشیر ابرو کے علاوہ دلفریب طرز استدلال کے دشنہ و خنجر بھی ہیں - مختصر یہ کہ مناظرہ ہوا، اور قرۃ العین نے "جھوٹ کہدو تو یقین آجانے والے" انداز میں ایسی تقریر کی کہ حریف نے سپر ڈال دی - اس نے کہا:-

"از روئے خبر ہا و حدیث ہا مہدی باید حقایق را بمردم بیاموزد و، برابر او آئینہا و کیشہائے پیمبران بے ارزش ہست"

(اخبار و احادیث کی رو سے مہدی کو چاہئے کہ وہ حقایق کی تعلیم دے اور اس کے مقابلہ میں سابق پیغمبروں کی شریعتیں بے وقعت ہیں) اس نے کہا:-

"از آنجا ئیکہ باب قایم است، قایم حق دارد در آئین و کیش ہا دست برد چوں قایم ہنوز کتاب خود را نیاورده پس زمان فطرت است و ہمہ تکلیف ہا از گردن مردم افتاد است"۔

(چونکہ باب قایم ہے اسے حق پہونچتا ہے کہ وہ شریعت میں تصرف کرے - چونکہ قائم پر ابھی کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اسلئے یہ زمانہ زمان فطرت (دو پیغمبروں کی بعثت کا درمیانی زمانہ) ہے اس لئے لوگوں پر سے تمام تکلیفات شرعی اٹھا دی گئی ہیں) - اس موثر تقریر کا کافی اثر ہوا - کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد تمام مرد و زن جو وہاں موجود تھے محو اختلاط ہو گئے اور دادِ عیش دینے لگے - یہاں تک کہ بابیوں کے مستند مورخ حاجی مرزا جانی نے جو اس منظر کی تاب نہیں لا سکا، اپنی کتاب نقطۃ الکاف میں اس کی مذمت کی ہے، اس واقعہ کے بعد قرۃ العین کھلم کھلا ملا محمد قدوس کے ساتھ ایک ہی کجاوہ میں بیٹھ کر سیر کرنے لگی۔

جب بدشت کے لوگ ان حیا سوز واقعات کو دیکھ دیکھ کر تنگ آگئے تو ایک رات انھوں نے کافی شور مچایا اور بابی، بدشت سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی تھی اس لئے لوگ جس شہر یا قریہ میں گئے بیگ بینی و دو گوش نکال دئے گئے۔

یہ بابیوں کے لئے بڑے انتشار کا زمانہ تھا، ناصر الدین شاہ ۱۸۴۸ء میں تخت پر بیٹھ چکا تھا اس کا وزیر اعظم میرزا تقی خاں، بابیوں کا سخت دشمن تھا، اس نے بابیوں کے خلاف نہ صرف سخت اقدامات کئے بلکہ اسی کے ایما سے باب کو ۹ جولائی ۱۸۵۰ء میں پھانسی دیدی گئی - ۵۰-۱۸۴۹ء میں بابیوں نے شاہی فوجوں سے مازندران میں شیخ طبرسی کے مقام پر خونریز لڑائی لڑی اور ابتدا میں شیخ طبرسی، زنجان یزد اور سیرپز میں فتوحات بھی حاصل کیں لیکن ۹ جولائی ۱۸۵۰ء میں جب باب کو پھانسی دی گئی تو ان کی کمر ٹوٹ گئی۔

شیخ طبرسی کی جنگ تاریخ میں جنگ قلعہ طبرسی کہلاتی ہے - یہ لڑائی تقریباً سات مہینے تک جاری رہی اور اس میں پیروان باب کافی تعداد میں کام آئے - جب بابیوں کو بری طرح شکست ہوئی تو قرۃ العین نے بمقام دژ بھاگ جانا چاہا لیکن شاہی فوج نے دژ کا پہلے ہی سے احاطہ کر لیا تھا - مختصر یہ کہ قرۃ العین گرفتار ہوئی اور اسے طہران بھیجا گیا، جہاں اسے میرزا محمود خاں کلانتر کے مکان میں نظر بند کر دیا گیا اس کا قیام بالا خانہ پر تھا، وہاں بھی وہ راتوں میں سیڑھی کی مدد سے باہر آنے جانے لگی اور بابیوں سے ربط ضبط قایم رکھا - اسکے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو بابیوں کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا - ہوا یہ کہ جب بابیوں کا جانی دشمن یعنی ناصر الدین شاہ کا وزیر اعظم میرزا تقی خاں کو حاجب الدولہ حاجی علی خاں نے ۹ جنوری ۱۸۵۲ء کو قتل کیا، تو بابیوں نے کافی خوشیاں منائیں اور چونکہ باب کو اسی نے قتل کروایا تھا اس لئے انھوں نے اس کی قوت کو انتقام ربانی سے تعبیر کیا، ان کی ہمتیں بڑھ گئیں اور ان میں سے تین چیدہ آدمیوں نے

۱۵ر اگست ۱۸۵۲ء کو ناصرالدین شاہ پر قاتلانہ حملہ کیا مگر ناکام رہے۔
ناصرالدین شاہ نے اس واقعہ کے بعد بابیوں کی بیخ کنی کا تہیہ کرلیا اور تقریباً ۲۸ ممتاز پیشوایانِ باب کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔
ناصرالدین شاہ، قرۃ العین کو نہیں بھولا تھا، لیکن چونکہ یہ نوجوان بادشاہ ایک عورت کے خون سے اپنا دامن داغدار کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے دو آدمی حاجی ملا محمد اندرمانی کو قرۃ العین کے لئے اب زندگی میں کشش ہی کیا رہی تھی، اس کا محبوب ہیرو جامِ شہادت نوش کرچکا تھا، اس کے جانباز ساتھی ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے تھے، اب وہ تھی اور اس کے خوابوں کی لٹی ہوئی دُنیا وہ اپنے عقاید پر اڑی رہی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رات حکومت کے کارندے اسے محمود خاں کلانتر کے مکان سے باغ ایلخانی لے گئے (یہ وہی مقام ہے جہاں بقول مدیر آژنگ آج کل "بانک ملی" (ریزرو بینک) کی عمارت قایم ہے) اور عزیز خاں نے جو بابیوں کا پیچھا کرنے اور انھیں قتل کرنے پر مامور تھا، قرۃ العین کی گردن میں ایک بڑا رومال باندھا اور اسے ایذائیں دے دے کر اور گلا گھونٹ گھونٹ کر مار ڈالا، اس کی لاش قریبی کنوئیں میں ڈال دی گئی۔ یہ واقعہ ۱۸۵۲ء میں پیش آیا۔ اس وقت بقول مصنف "ظہورالحق" قرۃ العین کی عمر صرف ۳۶ سال تھی۔

قرۃ العین، جیسا کہ کہا جاچکا ہے، شاعرہ بھی تھی لیکن صاحب دیوان نہ تھی، اس کے اکثر اشعار اس کے مذہبی معتقدات کی ترجمانی کرتے ہیں جس سے اس کے خلوص اور والہانہ خلوص اور والہانہ شیفتگی کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معتقدین نے بہت سے اشعار اس کے نام سے منسوب کردئے ہیں۔ مثلاً ایک ترکیب بند اس کے نام سے منسوب ہے جس میں ہر بند کے پہلے چار مصرعے بحر ہزج مسدس محذوف میں ہیں اور آخری دو مصرعے بحر متقارب مثمن اثلم میں ہیں، جس کا التزام فارسی جدید شاعری میں کیا جاتا ہے مثلاً:-

بود سوئے تو ام راز نہانی — کہ زانم ہست عیش و کامرانی
شدم چوں آشنائے یار جانی — بزم خالی از بیگانہ تو،
ای ماہرویم ای مشک مویم
یارم توی تو ای شہریارم

اس نظم کے اکثر اشعار خارج از وزن ہونے کے علاوہ بندش الفاظ کے لحاظ سے بھی سست ہیں اس لئے قرۃ العین سے ان کی نسبت رد کردی گئی۔ ایک نظم بعنوان "عید آمد" کو مؤلف زنان سخنور نے اس بنا پر رد کیا کہ وہ "طرح نوی" میں ہے۔

اس سلسلہ میں مدیر آژنگ کی رائے ملاحظہ کیجئے:-

"اشعار زیادے فعلا در دست است کہ بہ قرۃ العین نسبت می دہند۔ ولی اغلب آنہا اثر شعرائے دیگر است۔ ولی تردیدی نیست کہ خود قرۃ العین نیز اشعار شیوائے دارد و بسیارے از آنہا را کسانی کہ با شعر فارسی سروکار دارند می شناسند"۔

بہرحال چونکہ قرۃ العین کے اکثر اشعار میں اس کے بابی عقاید کی ترجمانی ملتی ہے اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر بابی مسلک کی مقبولیت، پیروانِ باب کے سرفروشانہ جذبے اور بابی عقاید کی ترجمانی ملتی ہے اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر بابی مسلک کی مقبولیت پیروانِ باب کے سرفروشانہ جذبے اور بابی عقاید سے متعلق اڈورڈ براؤن کے خیالات کا یہاں اعادہ کیا جائے، وہ لکھتا ہے:-

"تعزیوں کا ایک اثر یہ بھی ہوا ہے کہ ان سے اکثر ایرانیوں میں شوق شہادت کا جذبہ پیدا ہوگیا"۔۔۔ پادری نیپٹر مالکم نے اپنی بیش بہا کتاب "ایک ایرانی شہر میں پنج سالہ قیام" میں بابی اور بہائی شہیدوں کی بہادری و استقلال کا جو بے لاگ بیان پیش کیا ہے وہ کہیں اور نہیں ملکہ ایک اور مشنری نے مجھ سے اپنا ایک چشم دید دلچسپ واقعہ بیان کیا کہ اس شہر کے خاص مجتہد نے شرک کے الزام میں چند

بابیوں کے قتل کا حکم صادر کیا تھا۔ چونکہ اس مشنری کے مجتہد سے دوستانہ تعلقات تھے اس لئے اس نے ہمت کر کے ان بابیوں کی طرف سے سفارش کر دی۔ شروع میں مجتہد کو یہ دخل در معقولات بہت بُری لگی، لیکن جب ان سے اس مشنری نے کہا:۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس فرقہ کی غیر معمولی مقبولیت اس وجہ سے ہے کہ اس کے مذہبی اصول اعلیٰ پایہ کے ہیں؟ کیا اس کی وجہ ان لوگوں کا (جنھیں آپ اور آپ کے ہم مشرب محض ان کے عقاید کے لئے سزائے موت دیتے ہیں) والہانہ جذبہ سرفروشی نہیں؟ اگر ابتدا ہی سے بابیوں کو سخت سزائیں نہ دی جاتیں جنھیں ان لوگوں نے ہنستے کھیلتے قبول کیا تھا تو کیا آج ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جاتی یا اس لئے اگر آپ ایک بابی کو سزائے موت دیتے ہیں تو اس کی جگہ سو نئے بابی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں"۔ مجتہد کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر کہا:۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، میں ان لوگوں کی جاں بخشی کر دوں گا ..... اکثر بابی شہداء اشعار گنگناتے ہوئے جاں بحق ہو جاتے تھے۔ جب سلیمان خاں کو آگ میں ڈالا گیا تو وہ یہ شعر گا رہا تھا:۔

یک دست جام بادہ و یک دست زلفِ یار رقصے چنیں میانۂ میدانم آرزو ست

اسی طرح جب ایک پر جلاد نے تلوار کا وار کیا اور وار خالی جانے کی وجہ سے سر کے بجائے اس کی پگڑی زمین پر گر پڑی تو وہ یہ شعر پڑھ رہا تھا:۔

ای خوش آں عاشق سرمست کہ در پائے حبیب سر و دستار نداند کہ کدام انداز د"

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:۔ "بابیت اپنی ابتدائی اور اصلی شکل میں انتہائی مبالغہ آمیز شیعیت تھی اور باب، امام غائب حضرت مہدی کا دروازہ تھے۔

رفتہ رفتہ وہ خود کو امام غائب ہی سمجھنے لگے، پھر وہ "نقطہ" یعنی وجود اعلیٰ کا حقیقی مظہر بن گئے اور ان کے خاص خاص مرید آئمہ علیہم السلام کے اوتار بن گئے۔

باب کی تمام تحریروں میں سب سے زیادہ قابل فہم اور مربوط تصنیف ان کی فارسی کتاب "بیان" ہے جن کے ۱۹، ابواب میں صرف یہی عقیدہ پیش کیا گیا ہے کہ اسلامی دور کی تمام سربرآوردہ شخصیتیں دنیوی زندگی کے اس مادی چکر میں بار بار رجعت کرتی ہیں چنانچہ اولین بابی مورخ حاجی مرزا جانی نے جو خود ۱۸۵۲ء کے مظالم کا شکار ہوا تھا "نقطۃ الکاف" میں میدان کربلا اور شیخ طبرسی کا ایک طویل موازنہ کیا ہے اور آخر الذکر کی برتری ثابت کی ہے۔

ایڈورڈ براؤن نے اپنی کتاب "مواد تحقیق در مذہب بابیہ" میں قرۃ العین کی دو نظمیں مع منظوم ترجمہ شایع کی ہیں۔ ان میں سے ایک نظم کا مندرجہ ذیل شعر انھوں نے تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم میں پیش کیا ہے۔ جس سے قرۃ العین کے عقیدہ "حور قلیائی" پر روشنی پڑتی ہے:۔

من و عشق آں مہ خوبرو کہ چو شد صلائے بلا برو

بنشاط و قہقہہ شد فرو کہ انا الشہید بکربلا

اسی نظم کے دو اور شعر ملاحظہ فرمایئے:۔

تو و تخت و تاج سکندری، من و رسم و راہِ قلندری

اگر آں خوشست تو درخوری، وگر ایں بد است مرا سزا

لیکن نظم مذکورہ بالا کو نقل کر کے مؤلف زنان سخنور جلد دوم میں لکھتے ہیں:۔

"این چکامہ کہ از تذکرۃ النساء و چند ابیات آں از کتاب ظہور الحق گرفتہ شدہ سید احمد کسروی انتساب این شعرا بصحبت لاری رد کردہ است"۔

قرۃ العین نے ایک دوسری نظم میں کربلا والے مضمون کو یوں ادا کیا ہے :-

متموج آمدہ آں بحر کہ کربلا ش بخونی — منظہر است بہر دمے دو ہزار وادی کربلا[1]

پیروانِ باب، سید باب کو خدا نہیں بلکہ "خدا آفرین" سمجھتے تھے۔ اس کی مثال مندرجۂ ذیل دو شعروں میں ملتی ہے جو اس کی نظم "مثنوی در بشارت صبح ازل" میں پائے جاتے ہیں۔ یہ مثنوی مع منظوم ترجمہ ایڈورڈ براؤن نے اپنی مذکور الصدر کتاب (مواد تحقیق در مذہب بابیہ) میں درج کی ہے :-

شدم منفعل خوانمت من خدا — خدا ہا شد از بندگانت بپا

"انا اللہ" زناں بندگان تو اند — خدا ہا کناں چاکران تو اند

اسی خیال کو آگے چل کر بہاء اللہ کے کسی مرید نے اپنے مرشد کی شان میں کہا تھا :-

خلق گویند خدائی و من اندر غضب آیم — پردہ برداشتہ میسند بخود ننگ خدائی

مثنوی "در بشارت طلوع صبح ازل" کا انداز بیان یکسر روایتی ہے اس لئے اسے قلم انداز کیا جاتا ہے۔ یوں تو قرۃ العین کی اکثر نظموں میں باب کی تعریف میں عقیدتمندانہ اشعار ملتے ہیں لیکن کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں خالص شعریت ہے۔ ایک نظم ملاحظہ کیجئے :-

گر بتو افتدم نظر چہرہ بچہرہ، روبرو — شرح دہم غم ترا نکتہ بنکتہ مو بمو

از پئے دیدنِ رخت ہمچو صبا فتادہ ام — کوچہ بکوچہ در بدر خانہ بخانہ کو بکو

در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز وفا — صفحہ بصفحہ لا بلا پردہ بپردہ تو بہ تو

نظم "مظہر کبریا" کے مندرجۂ ذیل اشعار میں کس قدر موسیقیت ہے :-

در عشقت اے صنم شیفتۂ بلا منم، — چند مغایرت کنی با غمت آشنا منم

پردہ بروئے بستۂ زلف بہم شکستۂ — از ہمہ خلق رستۂ از ہمگاں جدا منم

شیر توئی شکر توئی شاخ توئی ثمر توئی — شمس توئی قمر توئی، ذرہ منم ہبا منم

---

[1] اس مضمون کو ایک بابی شاعر نبیل نے یوں باندھا ہے :-

شہدائے طلعت نار من، — بدوید سوی مزار من

دل و جاں کنید نثار من — کہ منم شہنشہۂ کربلا

اگر آپ ادبی و تنقیدی لٹریچر چاہتے ہیں تو یہ سالنامے پڑھئے

اصناف سخن نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ حسرت نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ مومن نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول
ریاض نمبر = قیمت دو روپیہ علاوہ محصول۔ داغ نمبر = قیمت آٹھ روپیہ علاوہ محصول۔ (جملہ صفحات)
لیکن یہ سب آپ کو بتیس روپیہ میں معہ محصول مل سکتے ہیں، اگر یہ رقم آپ پیشگی بھیجدیں۔

نیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

(۱)

فارقلیط

ایک صاحب[1] - حیدرآباد

"فارقلیط" کس زبان کا لفظ ہے اور اس کا کیا مفہوم ہے۔

(نگار) توریت یا صحفِ موسیٰ میں ایک پیغمبر کی آمد کی پیشین گوئی کا ذکر ہے جس کی تصدیق حضرت مسیح کی طرف سے بھی انجیل میں پائی جاتی ہے۔ اس پیغمبر کا ذکر عبرانی زبان میں کس نام یا اسم صفت سے کیا گیا تھا، اس کا صحیح علم نہیں، کیونکہ عبرانی زبان کی توریت و انجیل کا اصلی و صحیح نسخہ مفقود ہے۔ البتہ اس کا ترجمہ جو یونانی زبان میں کیا گیا تھا، وہ اس موعودہ پیغمبر کو لفظ "Paraclete" سے موسوم کرتا ہے۔ جب عربی میں توریت کا ترجمہ کیا گیا تو "Paraclete" کو معرب کر کے فارقلیط کر دیا گیا۔

اب رہا یہ امر کہ "Paraclete" کا اصل مفہوم کیا ہے سو انجیل کے انگریزی نسخہ میں اس کا ترجمہ Comforter (تسلی دینے والا) کیا گیا ہے لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ترجمہ بالکل درست ہے کیونکہ اصل لفظ عبرانی ہمارے سامنے نہیں ہے۔

کلام مجید کی سورۂ صف میں بھی اس پیش گوئی کا ذکر پایا جاتا ہے:-

"واذ قال عیسیٰ ابن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد"

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسیٰ نے اپنی پیشین گوئی میں آنے والے پیغمبر کا نام احمد ظاہر کیا تھا۔ اور چونکہ رسول اللہ کا نام محمد کے علاوہ احمد بھی تھا اس لئے یہ امر قرین قیاس ہے کہ عبرانی میں جو نام بتایا گیا تھا اس کا مفہوم وہی ہوگا جو لفظ احمد کا ہے یعنی "بہت زیادہ حمد کرنے والا" اور اس کا ثبوت یونانی لفظ Paraclete سے بھی ملتا ہے، کیونکہ اس کا ترجمہ اگر Comforter صحیح ہے تو وہ بھی احمد کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے، کیونکہ جو خدا کی زیادہ حمد کرنے والا ہوگا وہ یقیناً زیادہ امن و سکون پسند ہوگا۔

---

[1] ان کا خط گم ہو گیا، اس لئے نام درج نہ ہو سکا۔

(۲)

غالب کا ایک شعر

(محمد اسماعیل صاحب - پٹنہ)

غالب کا شعر ہے :-

نہ محمل پردۂ محمل مگو فریاد در رامیرم — کہ می خاید بذوق فتنہ شادروان مشکورا
بے خطر از خودی بر آلب بہ انا الضم کشا — شیوۂ گیرودار نیست در کنش کنشت ما

اس میں "شادروان مشکو" سے کیا مراد ہے۔ اور کنش کے کیا معنی ہیں۔ یہ لفظ عام لغات فارسی میں نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ بہار عجم میں بھی نہیں ہے۔

(نگار) "شادروان" کہتے ہیں اس قیمتی بساط کو جو امراء کے مکانوں میں فرش زمین پر بچھائی جاتی ہے۔
مُشکو، فارسی میں بُت خانہ اور حرم خانۂ شاہی کو کہتے ہیں اور مشہور مغنی بارید کی ۳۰ راگنیوں میں سے ایک راگنی کا نام بھی یہی ہے۔ فارسی میں اب ہر قصر یا شاندار عمارت کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تلفظ فارسی میں بضم شین بھی ہے اور بفتح شین بھی۔ بحالت وضاحت توصیفی و تملکی "مشکوے" بھی لکھا جاتا ہے جیسے "مشکوے معلیٰ" یا "مشکوے خواجہ"۔
کنش، (بفتح کاف و کسرۂ نون) کے معنی عمل و کردار کے ہیں اور غالب نے اسی معنی میں یہ لفظ استعمال کیا ہے اور کہتا ہے کہ ہماری کنشت میں گیرودار نہیں ہے، بے خطر نعرۂ "انا الضم" بلند کر۔
کنشت، آتشکدۂ پارسیان کو کہتے ہیں — جدید فارسی میں کنش کار و کنش مند (بہ معنی عامل و کارگن) اسی لفظ کنش کے مرکبات توصیفی ہیں۔
اسی طرح کنشت سے کنشتو اور کنشتو کر نکلے ہیں جن کے معنی اُشنان کے ہیں (ایک قسم کی خوشبودار گھاس جس کو غسل کے وقت جسم پر ملتے ہیں)

---

(۳)

دعوتِ فکر و نظر

(سید مجتبیٰ حسن - سہارنپور)

دعوتِ فکر و نظر کے سلسلہ میں آپ نے ایک شعر درج کیا تھا :-

تاب جاں بخشیٔ بے مرفہ ستم لاتا کون — وہ تو یوں کہنے کو مجھ فکر مداوا ہی نہیں

اس پر بعض حضرات نے اپنے خیالات بھی ظاہر کئے تھے۔ کسی نے اس کو بہت بلند شعر ظاہر کیا اور کسی نے بے معنی۔ لیکن آپ نے اپنی رائے محفوظ رکھی تھی۔ خیال تھا کہ اس کے بعد کی اشاعت میں آپ اپنی رائے ظاہر کریں گے لیکن کسی وجہ سے آپ ایسا نہیں کر سکے۔ امید ہے کہ اس بحث میں آپ بھی حصہ لے کر اپنی صحیح رائے جلد ظاہر

فرمائیں گے۔

(نگار) اس شعر میں اختلاف رائے کا باعث لفظ بے صرفہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ پہلے لفظ صرفہ کی تحقیق کر لی جائے۔
صرف اور صرفہ دونوں عربی کے الفاظ ہیں، لیکن فارسی، اُردو شعراء نے بھی اس کا استعمال کیا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ عربی میں اس کا کیا مفہوم ہے۔

۱۔ صَرف، عربی کا مصدر ہے اور کلام مجید میں بھی گیارہ جگہ اس کا استعمال کیا گیا ہے:۔
سورۂ فرقان = "فما تستطیعون صرفاً ولا نصراً" = تم عذاب کو دور کر سکو گے اور نہ کسی کی مدد حاصل کر سکو گے (یہاں صرف کے معنی پلٹ دینے یا لوٹا دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے)
سورۂ فرقان = "لقد صرفناہ بینہم" = اور ہم نے بار بار اس کی صراحت کر دی ان کے درمیان۔
سورۂ یوسف = "فصرف عنہ کیدہن" = اُن کے مکر و فریب پلٹ دئے، بیکار کر دئے۔
سورۂ توبہ = "صرف اللہ قلوبہم" = اللہ نے ان کے دل پھیر دئے (گمراہی کی طرف)
سورۂ اعراف = "واذا صرفت ابصارہم تلقاء اصحاب النار" = جب نگاہیں اہلِ نار کی طرف پھیر دی جائیں گی۔
سورۂ آل عمران = "ثم صرفکم عنہم" = پھر تم کو پھیر دیا یا لوٹا دیا ان کی طرف سے۔
سورۂ احقاف = "واذ صرفنا الیک نفراً من الجن" = اور جب ہم نے لوٹایا یا واپس کیا تیری طرف ایک نفر جن کا۔
سورۂ کہف / سورۂ اسرائیل = "ولقد صرفنا فی ہذا القرآن للناس من کل مثل" = ہم نے قرآن میں بہت سی مثالیں صرف (استعمال) کی ہیں۔
سورۂ طٰہٰ = "وصرفنا فیہ من الوعید" = اور ہم نے اس میں وعید یا عذاب کا ذکر یا صراحت کر دی ہے۔
سورۂ احقاف = "وصرفنا الآیات" = اور ہم نے نشانیاں بار بار لوٹائیں یا دکھائیں۔
ان آیات میں ۲ جگہ صرف کا استعمال مصدر ثلاثی کے مشتقات کی حیثیت سے ہوا ہے اور پانچ جگہ مصدر غیر ثلاثی (باب تفعیل) کے مشتقات کی حیثیت سے۔ لیکن ان تمام آیات میں لوٹانے، پلٹانے ——— رد کرنے کا مفہوم کسی نہ کسی حیثیت سے ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

کلام عرب میں یہ لفظ اور بہت سے معنی میں بھی مستعمل ہے مثلاً:۔
۱۔ حوادث زمانہ کو صرف الدہر کہتے ہیں۔
۲۔ بہت آراستگی و تکلف کے ساتھ بات کرنے کو صرف الحدیث کہتے ہیں۔
۳۔ فضل و زیادتی کے مرتبہ کے معنی میں کہتے ہیں:۔ "لہ علیہ صرف" یہ وہ فلاں شخص سے افضل ہے۔
۴۔ توبہ و عدل کے معنی بھی احادیث سے ثابت ہوتے ہیں۔
۵۔ خالص۔ بے میل۔ چنانچہ "صَرَف الشراب" کے معنی میں اس نے خالص شراب پی۔ صرف کبھی خالص کے معنی میں آتا ہے۔
۶۔ خرچ کرنا۔ جیسے "صَرَفَ المال" (مال خرچ کیا)۔ اس سے اور مصادر بھی عربی میں بنتے ہیں۔ مثلاً:۔ انصراف (لوٹ جانا، واپس چلا جانا، فروخت کرنا)۔ تصرّف (تدبیر و عمل)۔ تصریف (ادل بدل کرنا)۔ اس سے صارف، صروف، صریف، مصرف، مصروف، متصرف، صرّاف وغیرہ مشتق ہیں۔ جس کے معنی علٰحدہ علٰحدہ ہیں۔ لیکن ان سب میں بنیادی خیال تغیر، ادل بدل، تردید، یعنی اِدھر سے اُدھر کرنے کا کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور پایا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی میں اس ستارہ (غالباً زہرہ) کو بھی صرفہ اسی لئے کہتے ہیں کہ جب وہ منازل قمر میں سے کسی منزل سے

گزرتا ہے تو سردی پلٹ جاتی ہے۔
عربی میں چونکہ اس کے معنی زیادتی، مرتبہ اور فضل کے بھی ہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ فارسی میں اس لفظ کے استعمال کی بنیاد زیادہ تر اسی معنی پر رکھی گئی ہے، جس کی پیروی اُردو شعراء کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔

فارسی میں صرفہ کے معنی فایدہ و فرصت کے بھی ہیں اور احتیاط و تنگی کے بھی۔ اور مختلف مصادر کے ساتھ اس کے معنی بھی بدلتے رہتے ہیں مثلاً:- صرفہ دادن (فرصت دینا) - صرفہ داشتن (سبقت کرنا) صرفہ بُردن (غالب آنا) - بہارِ عجم میں مختلف معنی کی مثالیں دی ہیں۔
گویا فارسی میں یہ لفظ اپنے مفہوم کے لحاظ سے محتمل الضدین ہے۔ چنانچہ درویش والہ ہروی کا شعر ہے:-

ورشیفتۂ بادہ شوی صرفہ نگہدار کایں عربدہ جو سخت تنک ظرف و غیور ست

یہاں صرفہ احتیاط کے معنے میں استعمال کیا گیا ہے یعنی اس کا بے جا صرف نہ کرو۔
اسی طرح تنگی خرچ کے معنی میں خواجہ نظامی لکھتے ہیں:-

نہ بذلے کہ طوفاں درآرد بمال نہ صرفہ کہ سختی در آرد بجاں

یا طالب آملی کا شعر ہے:-

بکن صرفہ مے باسراف کوش خم از تُست چنداں کہ خواہی بنوش

یعنی صرف شراب میں تنگی سے کام نہ لو۔
غالب کا ایک شعر ہے:-

درعرضِ شوق صرفہ نبردیم در وصال درشکوہائے خواہ مخواہش گرفتہ ایم

غالب نے صرفہ، احتیاط و فایدہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔
غالب نے ایک اور شعر میں بے صرفہ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے:-

ہر خوں کہ عبث گرم شود در دلم افسگن ہر برق کہ بے صرفہ جہد بر اثرم ریز

یہاں بے صرفہ بہ معنی بے فایدہ و عبث استعمال ہوا ہے۔
حاکم لاہوری کا ایک شعر ہے:-

بسکہ دارد صرفہ از ما گرد جولانِ ادا میرود از دست تمکیں چیدہ دامانِ ادا

اس شعر پر خان آرزو نے اعتراض کیا کہ صرفہ کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔
اس کے جواب میں وارستہ نے لکھا کہ حاکم لاہوری نے صرفہ بہ معنی احتیاط و فایدہ استعمال کیا ہے اور اس معنی کے ثبوت میں ظہوری کا یہ شعر پیش کیا ہے:-

صبر کے راہ شوق می گیرد صرفۂ جنگ در گریز مرا

دوسرا شعر فردوسی کا درج کیا:-

ازیں صرفہ کاری شد دیں سودِ او کہ مذموم شد نامِ محمودِ او

(لیکن اس شعر میں صرفہ کاری کا مفہوم مکر و حیلہ ہے نہ کہ احتیاط یا بخل)۔ تیسرا شعر محسن تاثیر کا پیش کیا:-

نقدِ ہستی بر مہش گر ہمہ ایثار کنم صرفہ از دست سر زلف تو یک مو نہ بد

اس شعر میں بے شک صرفہ کا استعمال فایدہ کے معنی میں ہوا ہے۔
اُردو میں صرفہ و بے صرفہ دونوں مستعمل ہیں — داغ کا شعر ہے :-

نہ کر اے چارہ اگر ناحق کا صرفہ زہر دینے میں
جو مرنے کے نہیں قابل تو کیا جینے کے قابل ہوں؟

یہاں صرفہ بہ معنی "بُخل و پس و پیش" استعمال ہوا ہے۔
مصحفی کا شعر ہے :-

جی دینے میں صرفہ نہ کیا ہم نے کسی سے
ہر چند کہ اس بات میں اپنا ہی زیاں تھا

یہاں بھی صرفہ کا مفہوم احتیاط و بُخل ہے۔
میں نے جناب اثر لکھنوی سے بھی بے صرفہ کے استعمال کی کچھ مثالیں طلب کی تھیں، انھوں نے ایک شعر اشک لکھنوی کا لکھا

میں پیا کرتا ہوں یونہی بادۂ حُبِ علی
جس طرح بے صرفہ پی جاتا ہے دیوانہ شراب

اس شعر میں بے صرفہ "بے اندازہ" اور "حد سے زیادہ" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرا شعر انھوں نے میر کا لکھا :-

دنیا ہے، بے صرفہ نہ ہو رونے میں یا کڑھنے میں تو
نالہ کو ڈگر صبح کر، گریہ کو وردِ شام کر

اس میں بے صرفہ، بُخل، کمی و احتیاط کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔
دعوتِ فکر و نظر کے سلسلہ میں جناب اثر نے اس سے پہلے بھی ایک شعر میر کا نقل کیا تھا :-

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے حُسن کو ہے صرفہ نے عشق کو محابا

اس شعر میں صرفہ غالباً افسوس یا دریغ کے معنی میں استعمال ہوا ہے یا پروا کے مفہوم میں۔

اب "دعوتِ فکر و نظر" کے شعر پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کا سمجھنا صرف مفہوم بے صرفہ کی تعیین پر منحصر ہے اور اسی کے ساتھ اس بات پر کہ جاں بخشی کا اس سے کیا تعلق ہے۔
اس میں شک نہیں کہ "بے صرفہ ستم" مقلوب اضافت توصیفی ہے، یعنی "جاں بخشیِ ستم بے صرفہ" کی جگہ، جاں بخشیِ "بے صرفہ ستم" کہا گیا ہے، اس طرح جاں بخشی مضاف ہوا اور پورا فقرہ "بے صرفہ ستم" مضاف الیہ ہوا۔ لیکن اس سے پہلے ایک اور مضاف تاب بھی موجود ہے اور جس کا مضاف الیہ "جاں بخشیِ بے صرفہ ستم" کا پورا فقرہ ہے۔ اس طرح مضاف اندر مضاف ہونے کی وجہ سے بہت وسیع مفہوم ایک چھوٹے سے فقرہ کے اندر سما گیا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معنًا تاب سے اس کا کیا تعلق ہے۔
یہ جاننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے "بے صرفہ ستم" کو سمجھ لیا جائے اور اس کے بعد "جاں بخشیِ بے صرفہ ستم" کے مفہوم پر غور کیا جائے۔
بے صرفہ کا مفہوم اگر عبث یا بیکار قرار دیا جائے تو بے صرفہ ستم کے معنی ستم بے نتیجہ کے ہوں گے اور ستم جو بے نتیجہ ہو یعنی جان لیوا نہ ہو، اس کو ہم مجازاً جاں بخشی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے شاعر اگر "تابِ جاں بخشیِ بے صرفہ ستم" کی جگہ "تابِ دلداریِ بے صرفہ ستم" لکھتا تو مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا۔ لیکن اس کے بعد بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاب کہنے کا موقع کیا تھا؟ اور شاعر ما عاشق کو

کیونکر معلوم ہوا کہ معشوق نے جو ستم کیا تھا اس میں جاں بخشی کا خیال بھی پوشیدہ تھا - میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر میں ایک ٹکڑا بلکہ ایک پوری تفصیل محذوف ہے (جیسا کہ اکثر مومن کے اسلوب شاعری میں پایا جاتا ہے) جس کا علم دوسرے مصرع کے اندازِ بیان سے ہوتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ "مجھے فکرِ مداوا ہی نہیں" لیکن غور طلب یہ ہے کہ اگر فکرِ مداوا ہوتی تو وہ کیا کرتا، یقیناً محبوب سے اس کے جور و ستم کی شکایت کرتا اور اس کی تلافی چاہتا۔ اس خیال کے پیشِ نظر شاعر پھر غور کرتا ہے کہ اگر اس کا جواب معشوق کی طرف سے یہ ملتا کہ تو جور و ستم کی شکایت کرتا ہے حالانکہ تجھے شکر کرنا چاہئے، کیونکہ تجھ پر جو ستم کیا گیا وہ قصداً بے حرفہ یعنی بہت احتیاط سے کیا گیا (تاکہ تو زندہ رہے اور اس طرح تیری جاں بخشی ہوگئی) تو میں اس جواب کی تاب کیونکر لا سکتا تھا، کیونکہ اس صورت میں جان دیدینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، اس لئے اچھا ہی ہوا کہ مجھے فکرِ مداوا نہ تھی ورنہ نتیجہ یہ ہوتا کہ معشوق کا جواب سن کر مجھے جان ہی کھونا پڑتی۔

جناب آثر نے پہلے مصرع میں لاتا کون کی جگہ کیا لاتا اور دوسرے مصرع میں "وہ تو یوں کہئے" کی جگہ "وہ تو کہئے کہ" تجویز کیا ہے - لیکن مجھے اس سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لاتا کون میں زیادہ قوت و زور ہے یعنی ایک میں کیا دنیا میں کوئی تاب نہ لا سکتا تھا۔

اسی طرح دوسرے مصرع کی مجوزہ ترمیم کے بعد کہئے اور کہ دونوں کے کاف قریب آجاتے اس لئے "وہ تو یوں کہئے" میرے نزدیک زیادہ مناسب ہے، علاوہ اس کے "وہ تو یوں کہئے" میں جو انوٹ پائی جاتی ہے "وہ تو کہئے" میں نہیں ہے۔

ورسٹڈ ویونگ اور ہوزری یارن

کی

ضروریات کی تکمیل کے لئے، یاد رکھئے

حرفِ آخر

"کپور سپن"

KAPUR SPUN.

ہی ہے

تیار کردہ - کپور سپننگ ملز - ڈاک خانہ رآن اینڈ سلک ملز - امرت سر

چند لمحے غالب کے ساتھ

(جہنّم میں)

(نیاز فتحپوری)

میں فطرتاً بہت جری ہوں اور بڑی سی بڑی مصیبت میں بھی کبھی نہیں گھبرایا، لیکن جب ڈاکٹر نے بالکل اچانک مجھے صرف دو گھنٹے کا نوٹس، اس دُنیا سے چلے جانے کا دیدیا، جہاں میں اپنی زندگی کے چالیس سال بڑے لطف سے بسر کر چکا تھا، تو میں واقعی گھبرا گیا۔ ہر چند میں کمزور طبیعت کا انسان نہیں ہوں، لیکن غلط ہوگا کہ اگر میں یہ کہوں کہ میں موت سے کبھی نہیں ڈرتا تھا۔ میرا خیال کیا، یقین تھا کہ کم از کم ۸۰ سال تو ضرور جیوں گا کیونکہ میری صحت اچھی تھی، میرے تو اصحیح تھے، بیمار بہت کم پڑتا تھا، اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ مجھے دُنیا میں بہت سے کام کرنا تھے اور میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ فطرت اس قدر ظالم ہو سکتی ہے کہ وہ مجھے قبل از وقت اُٹھالے درآنحالیکہ دُنیا میں میرے رہنے سے اس کا کوئی نقصان نہ تھا۔

اس لئے جب میں نے یہ سُنا کہ ۸۰ سال میں دفعتاً ۴۰ سال کم ہو گئے ہیں اور میں اپنے تمام کاموں کو ادھورا چھوڑ جانے پر مجبور ہوں، تو میری تمام جراءت و ہمت ختم ہو گئی اور میری حالت اس کبوتر کی سی ہو گئی جو باز کے پنجہ میں پہونچ کر بازو پھٹ پھٹانے کی بھی قوت کھو بیٹھتا ہے۔ اور میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا جسم کے ریشہ ریشہ میں کسی نے برف پگھلا کر بھر دی ہے۔ سرد پیشانی سے ٹھنڈا پسینہ بہہ بہہ کر ٹپکنے لگا اور ہاتھ پاؤں ایسے ڈھیلے پڑ گئے جیسے ان میں جان نہ ہو۔

میں نے بہت کوشش کی کہ ڈاکٹر سے کچھ پوچھوں لیکن زبان نے کام نہ دیا اور میں بیہوش ہو کر وہیں فرش پر گر پڑا۔ اس کے بعد مجھے مطلق خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ سامنے سے ایک بڑا مہیب شعلہ چلا آرہا ہے تاہم تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اس کی روشنی بالکل نہیں پھیل سکتی اور گرمی کی شدت سے دم گھٹا جا رہا ہے۔ میں نے چاروں طرف ہاتھ پاؤں چلائے تو معلوم ہوا کہ میں کسی گڈھے کے اندر بند ہوں اور جگہ اس قدر تنگ ہے کہ اُٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ وہ شعلہ بڑھتے بڑھتے قریب آیا اور دو حصّوں میں تقسیم ہو کر میرے سامنے قایم ہو گیا۔ اب گرمی بہت زیادہ ہو گئی تھی اور کیفیت یہ تھی کہ جسم پسینہ کے ساتھ گھلا جا رہا تھا میں نے اپنے پاؤں سمیٹنے چاہے کہ کہیں یہ دونوں شعلے مجھے جلا نہ دیں لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں روشنیاں طول میں بڑھنے لگیں، یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک بہت لمبی سلاخ سی بن گئی اور عجیب قسم کے بھیانک سے چہرے ان میں سے پیدا ہو کر میری طرف گھورنے لگے۔ خوف سے میری آنکھیں بند ہو گئیں اور عجیب قسم کی ہیبت مجھ پر طاری ہونے لگی۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ کہیں نکیرین یہی تو نہیں ہیں، جن کا ذکر میں نے کتابوں میں پڑھا تھا، اور اس خیال کے آتے ہی میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ کوئی نہایت ہی وزنی چیز میرے سر پر مار رہے ہیں اور میرا دماغ پاش پاش ہوا جا رہا ہے، میں چیخ اُٹھا کہ "خدا کے لئے مجھے کیوں مارتے ہو" انھوں نے کہا کہ "آج تو ہمیں خدا کا واسطہ دلاتا ہے، لیکن یہ تو بتا کہ کبھی تو نے بھی خدا سے کوئی واسطہ رکھا تھا، تو نے اس کو ہمیشہ ایک قوت سمجھا اور قوت بھی مجبور قسم کی جو مقررہ اصول کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ پھر آج کیا ہوا جو اس کی پناہ میں آنا چاہتا ہے"۔

اب مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا کہ "یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ بات کا جواب بھی نہیں سنتے اور مارنا شروع کر دیتے ہو، مجھ سے سوال کیا ہے تو اس کا جواب بھی سُن لو پھر مارنے نہ مارنے کا تمھیں اختیار ہے"۔

وہ لفظ "انسانیت" سن کر بہت ہنسے (ان کی ہنسی بہت ہی مہیب قسم کا زہر خند تھی) اور بولے کہ "اے بیوقوف، انسان و انسانیت یہ سب دنیا اور مادی عالم کی اصطلاحیں ہیں، پھر یہ کہ ہم انسان کب ہیں جو ہم سے انسانیت کی توقع رکھتا ہے۔ ہم لوگ فرشتے ہیں، اور یوں ہی گرز چلاتے چلاتے نہ معلوم کتنا زمانہ گزر گیا ہے اور دشمنی کی وہ آگ جو آدم کی پیدائش کے وقت سے اندر ہی اندر بھڑکتی چلی آرہی ہے، اسے ہم اسی طرح بجھایا کرتے ہیں۔ بے شک ہم نے آدم کو سجدہ کیا تھا، لیکن وہ سجدہ مجبوری کا تھا خوشی کا نہیں۔

میں نے یہ خیال کر کے کہ ان کی گفتگو سے تو کچھ خدا کی طرف سے بیزاری پائی جاتی ہے بہت خوش ہو کر کہا کہ "سچ کہتے ہو، واقعی تمھاری سخت توہین کی گئی کہ خاک کے پتلے کے سامنے جھکنے پر مجبور کئے گئے۔ اس لئے اگر تم مجھے مہلت دو، تو میں تمھیں خدا کی بندگی کے عذاب سے نجات دلا دوں اور سچ پوچھو تو خدا تمھیں کو ہونا چاہئے کہ تمھارے گرز سے پہاڑوں کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ (خدا کا واسطہ صرف اس عادت کی بنا پر دلایا تھا، جو دنیا کی زندگی میں پڑ گئی تھی)۔ اچھا تو مجھے اُٹھاؤ اور اس تاریک غار سے باہر نکالو تاکہ میں آزادی سے سانس لے کر سوچوں کہ کیونکر تمھاری خدائی دنیا میں قایم ہو سکتی ہے"۔

وہ یہ سُن کر بہت ہنسے اور بولے کہ "ساری عمر میں تو ہی آج پہلا مُردہ ایسا ملا ہے جو ہمیں بہکا کر خدا سے منحرف کرنا چاہتا ہے احمق تجھے نہیں معلوم کہ ہماری تمام حرکتیں مشین کی طرح ہیں اور ہم کو نہ سوچنے کا اختیار ہے، نہ اُس کے علاوہ کچھ کرنے کا جو بے اختیاری طور پر ہم سے سرزد ہوتا رہتا ہے، زیادہ بک بک نہ کر، اُٹھ جہنم تیرا انتظار کر رہا ہے، اور آگ کے شعلے تیرے منتظر ہیں۔

اب مجھ کو بالکل پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں واقعی مر گیا ہوں اور جہنم کا نام سُن کر میرے حواس جاتے رہے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نکیرین غائب ہیں اور میرے گلے میں ایک زنجیر پڑی ہوئی ہے جو مجھے تپتے ہوئے ریگستان کے اوپر سے گھسیٹتی ہوئی کسی طرف لئے جا رہی ہے۔ اِدھر اُدھر جو میں نے نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ دور دور فاصلہ پر اور بھی سیکڑوں مُردے گھسیٹے جا رہے ہیں ان میں سے کوئی چیخ رہا ہے، کوئی تڑپ رہا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو میری طرح بالکل خاموش ہیں اور حد درجہ بیچارگی کے ساتھ گھسٹتے جا رہے ہیں۔

تھوڑی دور چل کر میں نے دیکھا کہ ہر مُردہ کی سمت رفتار بدل گئی ہے اور اب میں تنہا رہ گیا ہوں، وہ زنجیر دفعتہً مجھے ایک غار تک پہونچا کر غائب ہو گئی اور میں اس کے اندر اس تیزی سے جانے لگا جیسے کوئی اژدہا اپنی گرم سانس سے کھینچ رہا ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کب تک اس طرح گھسٹتا رہا لیکن جب یہ کشش دور ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو ایسے میدان میں پایا جو حد نظر تک وسیع تھا اور آگ کی گرمی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سُرخ آندھی چھائی ہوئی ہو۔

جا بجا چنگاریوں کے بگولے بلند ہو رہے تھے اور کہیں کہیں آگ کے فیل پیکر شعلے جن میں سے بعض بالکل تاریک تھے، اور بعض بالکل سفید، اس طرح اُٹھ رہے تھے جیسے طوفان میں سمندر موجیں لے رہا ہو۔

پیاس سے بُرا حال ہو رہا تھا، زبان باہر نکل پڑی تھی، تالو چٹخا جا رہا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں سے کھولتا ہوا پانی ہی میسر آجائے، لیکن کامیاب نہ ہوا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھ پر عذاب ہی ہونا ہے تو کیوں نہیں شروع ہو جاتا، اور کیوں نہیں مجھے آگ میں ڈال دیا جاتا کہ جل بھن کر خاک ہو جاؤں اور اس تکلیف سے نجات پاؤں۔

ناگہاں ایک فرشتہ سامنے سے اُڑتا ہوا نظر آیا جس کے پر و بازو شعلے کی طرح چمک رہے تھے اور جس کا چہرہ ایسا نظر آتا تھا جیسے کھولتا ہوا تانبہ۔ اس چہرہ میں صرف ایک آنکھ چاندی کی طرح درمیان میں چمک رہی تھی۔ جس کے اندر سے کبود رنگ کی شعاعیں، ببول کے کانٹوں کی طرح نکل نکل کر جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ میرے سامنے آکر قایم ہوگیا اس حال میں کہ اس کا سارا جسم ایسا نظر آتا تھا جیسے گندھک کے ڈھیر میں آگ لگ جائے۔

اس نے کہا "تمہارے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ فی الحال چند دن کے لئے جہنم میں آزاد چھوڑ دئے جاؤ اور سوا اس ایذا کے جو یہاں کی فضا میں از خود تمھیں پہونچ جائے کوئی اور عذاب مسلّط نہ کیا جائے"۔

یہ کہکر فرشتہ دھوئیں کی شکل اختیار کر کے فضا میں از خود تحلیل ہوگیا اور میں حیران کہ آزادی بھی ملی تو کہاں جاکر، لیکن اس خیال سے کہ خیر فردوس کی پابندی سے بہر حال جہنم کی آزادی بہتر ہے۔

—— آگے بڑھا اور یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اب بجائے چٹیل میدان کے نہایت وسیع قلعہ کا سا حصار سامنے ہے۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ ایک طرف نہایت وسیع جھیل کھولتے ہوئے پانی کی تھی جس میں نئے مُردے لا لاکر غوطہ دئے جارہے تھے اور اس طرح گویا سب سے پہلے ان کی چربی نکالنے کی رسم پوری ہو رہی تھی۔ عفونت سے دماغ سڑا جارہا تھا اور چیخ پکار سے کلیجہ دہلا جاتا تھا داہنی طرف نگاہ گئی تو بہت سے آہنی مکان نظر آئے، جن کی دیواریں بلند تھیں لیکن شعلے ان کے اوپر سے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ہر مکان کا ایک دروازہ تھا، لیکن بہت تنگ اور اس کے اندر سے دہکتی ہوئی آگ اس طرح نظر آرہی تھی، جیسے انجن کی بھٹی دروازہ کھلنے کے بعد۔

سب سے پہلے مکان کے دروازہ پر آتشیں حروف میں ابلیس کے نام کا بورڈ ٹنگ رہا تھا، لیکن یہ مکان مکین سے خالی تھا، کیونکہ قیامت کے دن تک یہ دُنیا میں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے، اندر صرف دھواں سا اُٹھ رہا تھا اور آتشکدے ہنوز روشن نہیں ہوئے تھے اس کے پاس ہی دوسرے مکان پر فرعون کا نام درج تھا۔ یہ نام دیکھتے ہی تمام وہ جھگڑے سامنے آگئے، جو اس کے اور موسیٰ کے درمیان ہوئے تھے اور بے تابانہ اندر داخل ہوگیا۔ دیکھا کہ ایک نہایت ہی مہیب شکل کا انسان بیتابانہ اِدھر اُدھر دوڑتا پھر رہا ہے، تمام جسم میں اس کے سانپ لپٹے ہوئے ہیں، اور وہ ان کے زہر کی تکلیف سے بیچین ہوکر قریب ہی ایک گڑھے میں جس کا پانی سرد معلوم ہوتا ہے کود پڑتا ہے لیکن اس کے کودتے ہی پانی میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ پھر وہاں سے گھبراکر باہر نکل آتا ہے۔

میں نے چاہا کہ اس سے کچھ پوچھوں، لیکن اس کی بیتابی کسی ایک جگہ لمحہ بھر کے لئے بھی ٹھہرنے کی اجازت نہ دیتی تھی، اس لئے میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ سامنے اس کے عذاب کا مفصل پروگرام دیوار پر منقوش تھا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ایک ہزار قسم کے عذابوں میں یہ صرف دوسرے قسم کا عذاب تھا جو ایک ہزار سال تک قایم رہے گا اس کے بعد تیسرے عذاب کا زمانہ آئے گا پھر چوتھے کا یہاں تک کہ جب یہ ہزار قسم کے عذاب پورے ہوجائیں گے تو پھر دس لاکھ سال کا دوسرا پروگرام بنایا جائے گا۔

میں گھبراکر یہاں سے نکلا تو قریب ہی قریب ہامان و شداد کے مکان نظر آئے، لیکن میں اندر نہیں گیا۔ اسی طرح قارون، نمرود سامری، ضحاک وغیرہ کی عذاب گاہوں سے گزر گیا، لیکن جب دفعتاً میری نگاہ کلیوپٹرا کے بورڈ پر پڑی تو ٹھہر گیا، کیونکہ مجھے اس سے ملنے کا بڑا شوق تھا اور میں چاہتا تھا کہ دیکھوں اس میں وہ کون سی بات تھی جس نے دُنیا کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔

اندر گیا تو سب سے پہلے ایک آتشیں آبشار نظر آئی جو ایک سنگین مورت پر تیزی کے ساتھ گر رہی تھی، جس وقت اس آبشار کی دھار اس بُت پر پڑتی تھی تو فوارہ کی شکل میں اس سے چنگاریاں بلند ہونے لگتی تھیں۔

یہ بُت کلیوپٹرا کا تھا، بلند بالا، پرشباب، آشفتہ گیسو، اور سر سے پاؤں تک بالکل عریاں و بے پردہ۔

دفعتاً وہ بت شق ہوا اور اس کے اندر سے ایک عورت انسانی شکل وصورت اور خدوخال کی نمودار ہوئی۔ اس کے تمام جسم پر چھوٹے چھوٹے آبلے موتی کی طرح جھلک رہے تھے، لبوں سے خون کے قطرے اور آنکھوں سے عنابی رنگ کے آنسو ڈھلک ڈھلک کر آبلوں پر رنگین خط ڈالتے ہوئے نیچے گر رہے تھے، گلے میں سفید انگاروں کا ایک ہار پڑا ہوا، آگ کی لپیٹ سے جنبش میں آکر جسم سے مس کرتا تھا اور ہر بار اس کے گورے، گورے جسم پر ایک سرخ نشان چھوڑتا جاتا تھا، اس عالم میں بھی اس پر ایک شاہانہ جمال کا رنگ پیدا تھا اور قہر و انتقامی اگر اس حال میں بھی اسے دیکھ لیتے تو شاید اس سے دوبارہ ملجانے کے گناہ میں ایک عمر اور دوزخ میں بسر کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے۔

میں چاہتا تھا کسی طرح اس کی وہ نگاہیں دیکھوں جن سے مسحور ہو کر انسان خوشی سے جام زہر پی جایا کرتا تھا، اس کی لانبی لانبی پلکیں خون تو ضرور ٹپکاتی رہیں، لیکن اس کی نگاہوں نے بلند ہو کر فضا کو مسموم نہیں کیا، تھوڑی دیر تک اسی حالت میں رہنے کے بعد وہ بت پھر شق ہوا اور اس کے اندر کلیو پٹرا سمانے لگی، یہ غالباً اس کے لئے سب سے بڑا عذاب تھا، کیونکہ جتنا حصہ اس کے جسم کا پتھر میں تبدیل ہوتا جاتا تھا اسی قدر زیادہ اس کے چہرہ سے کرب و ملال کے آثار ظاہر ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ جب گردن تک وہ پتھر کی ہو گئی تو ایک ایسی چیخ اس کے منہ سے نکلی جیسے سینکڑوں من بوجھ کے نیچے دب گئی ہو اور پھر دفعتاً اس کا چہرہ وسر بھی پتھر کا ہو گیا۔ دوزخ میں آنے کے بعد یہ پہلا منظر تھا جس نے بجائے غم و غصہ کے ملال کی کیفیت میرے اندر پیدا کی۔

یہاں سے نکلنے کے بعد مجھے نینوا و بابل کی اس مشہور رقاصہ کا مکان نظر آیا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہاروت و ماروت کو مبتلائے عشق کر کے اس نے اسم اعظم سیکھ لیا تھا اور آسمان پر زہرہ بن کر اڑ گئی تھی۔

یہاں آکر معلوم ہوا کہ آسمان پر اڑ جانا غلط خبر تھی، بلکہ وہ قعر جہنم میں ہاروت و ماروت کے ساتھ پھینکدی گئی تھی، میں اسکے بھی دیکھنے کا شایق تھا اس لئے اندر گیا۔

یہاں میں نے نہایت تاریک دھواں دیکھا، جس میں چنگاریاں جگنو کی طرح چمک رہی تھیں۔ دیر تک آنکھیں ملنے کے بعد اسی تاریکی میں دور ایک عورت نظر آئی جو انگاروں پر لوٹ رہی تھی اور جسم سے چربی اور خون کے قطرے ٹپک ٹپک کر آگ پر گر رہے تھے میں یہاں عرصہ تک نہیں ٹھہر سکا۔

میں یہاں سے نکل کر کہاں گیا، اور کن کن لوگوں کو عذاب میں مبتلا پایا، اس کی تفصیل بہت طویل و جانگداز ہے، اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جب اس طبقہ میں پہونچا جو صرف شاعروں کے لئے مخصوص تھا، تو میر، مصحفی، ناسخ، آتش وغیرہ خدا معلوم کن کن شاعروں سے مل کر غالب کے پاس پہونچا، تو وہاں ایک عجیب و غریب لطیفہ انھوں نے سنایا کہ:-

"جب میرے اعمال کا محاسبہ ہوا اور دوزخ کے قابل نہ سمجھ کر مجھے جنت کے نہایت ہی حقیر حصہ میں لیجا کر ایک ایسے حجرہ میں بند کر دیا، جہاں سوا ایک خشک درخت کے اور کچھ نہ تھا تو مجھ سے دریافت کیا کہ تم اپنی بہت سی آرزوئیں نامکمل چھوڑ کر آئے ہو اور تمھارے بہت سے ناکردہ گناہوں کی حسرت ہنوز داد طلب پڑی ہوئی ہے اس لئے بتاؤ ان میں سے کوئی ایک آج پوری کر دیجائے۔ میں نے فرط مسرت میں گھبرا کر کہدیا کہ "کوئی ایک"؟

میرے منہ سے یہ نکلنا تھا کہ "فردوس کے اس حجرہ کو اٹھا کر دوزخ میں ڈال دیا۔ میں حیران تھا کہ خدایا یہ میری کون سی آرزو تھی جو اس طرح پوری کی جا رہی ہے کہ ناگہاں سامنے دیوار پر یہ مصرعہ نظر آیا کہ: "دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو" اب میری سمجھ میں آیا کہ بات کیا ہے لیکن جس روح رسا تک معلوم نہیں اس شعر کا پہلا مصرعہ: "طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ" خدا کو سنایا گیا یا نہیں۔

ظاہر ہے کہ وہاں تک یہ بات نہیں پہونچی۔ ورنہ مجھے تو فردوس سے بھی بلند کوئی چیز ملنی چاہئے تھی نہ کہ ایسا حقیر و کثیف حجرہ، جو اگر جہنم میں نہ ڈال دیا جاتا تو میں خود اس میں آگ لگا دیتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ملاؤں نے یہاں بھی اپنا اقتدار قایم کرلیا ہے اور افسوس ہے کہ اب فردوس بھی رہنے کے قابل نہ رہی"

میں نے یہ سُن کر کہا کہ :- "آپ کا یہ خیال درست نہیں، کیونکہ میں نے تو آج ایسے ایسے مولویوں اور تہجد گزار بزرگوں کو دوزخ میں جلتے اور سسکتے دیکھا ہے کہ ان کی نسبت کبھی گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اعلیٰ علیین سے ایک قدم نیچے اُتریں گے"۔

یہ سُن کر وہ بہت متحیر ہوئے اور بولے کہ :- "پھر تو دوزخ بھی رہنے کے قابل نہ رہی، تمام عمر ان کے صلاح و تقوے کے وعظ نے مجھے دُنیا میں چین نہ لینے دیا۔ فردوس کا حال معلوم نہیں کہ وہاں میں نے چھ دیکھا نہیں، جہنم میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہ عذاب یہاں بھی موجود ہے، لاحول ولاقوۃ! مگر یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں کیونکر پہونچے۔

میں نے عرض کیا کہ مجھے بالکل اس کا علم نہیں۔ فی الحال آزاد چھوڑ دیا گیا ہوں، دیکھئے آیندہ کیا فیصلہ ہوتا ہے، ڈرتا ہوں کہ شاعروں کے سلسلہ میں کہیں جگہ نہ دی جائے کیونکہ ان پر جس قسم کا عذاب ہوتے میں نے دیکھا ہے وہ صد درجہ توہین آمیز ہے۔ انکے ہر ہر جھوٹے شعر کی ایک تمثالی صورت عذاب کی صورت میں پیش کی جاتی ہے اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ شاعر کس طرح جھوٹ بولتا ہے۔ معلوم نہیں آپنے یہ شعر:-

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

کسی واقعہ کی بنا پر کہا تھا یا نہیں۔ لیکن اگر یہ شعر جھوٹ کہا گیا ہے تو یقیناً یہ حرکت آپ کو یہاں کرنا پڑے گی اور ایک ہزار سال تک جو یہاں کی ریاضی کی اکائی ہے برابر آپ کو کسی نہایت ہی کمزور شکل والے کے پاؤں دابنا پڑیں گے۔ الغرض میں اسوقت سے کانپتا ہوں جب شعراء کے زمرہ میں مجھ پر عذاب نازل کیا جائے۔ ہر چند اس کا اندیشہ کم ہے کیونکہ اول تو میں نے شعر ہی بہت کم کہے ہیں اور جو چند کہے بھی ہیں تو وہ شعروں میں شمار ہونے کے قابل نہیں — وہ اس کا جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ دفعتاً اپنے ہاتھوں سے اپنا منہ نوچنے لگے، سینہ زخمی کرنے لگے میں نے خیال کیا کہ یقیناً یہ بھی کوئی عذاب ہے اور دیر تک سوچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ داد ہے ان کے اس شعر کی :-

تا بند نقاب کرکشود ست کہ غالب رخسار بہ ناخن صلہ دادیم و جگر ہم

مادرِ وطن کے فلاح و بہبود کے لئے

ہمارے اقدامات

نہایت نفیس، پائدار اور ہم وار

اونی ویونگ یارن

اور

ہینڈ نٹنگ وول

ہمارے ہاں جدید ترین طریقے سے طیار کئے جاتے ہیں۔

گوکل چند رتن چند وولن ملز (پرائویٹ) لمیٹیڈ (انکارپوریٹیڈ ان بمبئی)

کوئنز روڈ امرت سر

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا
سلکی پلین

جورجٹ
بجرگ
کریپ
ساٹن
ٹفاٹہ
بشرٹ کلاتھ
شنٹون
ہائلن
ننون

کپڑا
سلکی پرنٹس

فرنچ کوئین
چھوکرہ کوئین
ساٹن فلورنس
گولڈ کریپ
دل بہار
لِنن
شنٹون

کپڑا
اونی

گیبرڈین
سوٹنگ
شال
سرج
پاتامہ
پرشیا

ان کے علاوہ عمدہ نفیس سوتی چھینٹ اور اونی دھاگہ۔

تیار کردہ

دی امرتسر رین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹڈ جی۔ ٹی روڈ۔ امرتسر

تار کا پتہ:- "رین" (Rayon.)
ٹیلی فون 2562

سٹاکسٹ = ٹراونکور رین لمیٹڈ۔ برائے سلکی دھاگا اور مومی (سیلوفین) کاغذ

شباب و شاعر

(شعر منثور)

(نیاز فتحپوری)

وہ شبنم سے بھیگی ہوئی، برگ پوش گلاب کی کلی، جس کی سُرخی پتیوں کے خطِ انفصال پر ایسی نظر آرہی ہے، جیسے کسی کا محرم مسک جائے ——— تم نے دیکھی ؟

وہ قوسِ قزح، جس کی رنگینیاں ایک والہانہ پاکیزگی، ایک سماوی لحن کے ساتھ، بہار کی دیوی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے نمودار ہوتی ہے ——— تم نے دیکھی ؟

سمندر کا وہ جوش، جیسے کسی کا سینہ انتہائی ہیجان کے عالم میں تنفس کی شدت سے بے قابو ہو کر سمٹ سمٹ کر پھیل رہا ہو ——— تم نے دیکھا ؟

ماہِ کامل کا وہ عروج نیم شبی، جو دُنیائے شباب کو اپنی آبشار سیمیں کے لطیف نغموں سے مست و سرشار بنا کر باغ کے کنجوں میں دعوتِ سرگوشی سے بیتاب بنا دیتا ہے ——— تم نے دیکھا ؟

شہاب ثاقب کی وہ روشن لکیر، جو سرعت برق کے ساتھ فضا میں بلند ہو کر، ایک طرۂ زرکار بناتی ہوئی تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے ——— تم نے دیکھی ؟

صبح کے وقت افق کی وہ زراندود کیفیت، جیسے کسی نے سونا پگھلا کر چاروں طرف پھیلا دیا ہو ——— تم نے دیکھی ؟

اپریل میں کوہستان کشمیر کی وہ گل پوشیاں، جو برف پگھلنے کے بعد زمین کے اندر کی تمام مخفی رنگینیاں اور عطر بیزیاں لئے ہوئے چاروں طرف ایک افسوں سا پھونک دیتی ہیں ——— تم نے دیکھیں ؟

تاتار کا وہ غزال رعنا جو اپنے مشکنافہ کی نکہت سے مست ہو کر، صحرا کی پریوں کو سپردگی کی کیفیت سے بے تاب بنا دیتا ہے ——— تم نے دیکھا ؟

تم نے باغ کی کسی فصیل پر، طاؤس کو اپنی مستانہ آواز دلوں میں پیوست کرتے دیکھا ہے ؟

تم نے کبھی اُس پرشور آبشار کو دیکھا ہے جو پہاڑ کی بلندی سے گرتے ہوئے صحرا کو ایک ہنگامۂ لطیف سے لبریز کر دیتی ہے ؟

یقیناً تم نے یہ سب مناظر دیکھے ہوں گے، لیکن کیا تم نے ان تمام کیفیات کو ایک جگہ، کسی ہستی میں مجتمع دیکھا ہے ——— اگر نہیں، تو تم اس شکستہ حال، غریب الدیار، آوارہ گرد شاعر کے حال سے تعرض نہ کرو، جس نے سب سے پہلی بار ان سب کا اجتماع پنگھٹ پر ایک پانی بھرنے والی دہقانی لڑکی کے اندر دیکھا اور ہمیشہ کے لئے اندھا ہو گیا۔

شذرات

(نیاز فتحپوری)

آج دُنیا کو امن کی جستجو ہے، سکون کی تلاش ہے کیونکہ پھولوں کی چادروں سے چنگاری کی سوزش، زرکار ملبوس سے شعلوں کی تپش اور زر وسیم کے انبار سے آگ کی لپٹ محسوس ہو رہی ہے۔

بنارس کا مرتاض برہمن "قشقہ برجبیں" ہاتھ میں سمرن لے ہوئے اُٹھتا ہے اور کہتا ہے "میرے مندر میں آؤ، صدائے ناقوس سنو اور مورتی کے سامنے جھک جاؤ تاکہ یہ جلن دور ہو۔" دیوبند یا فرنگی محل کا عباپوش مولوی جریب و تسبیح لئے ہوئے رونما ہوتا ہے اور کہتا ہے:۔ "میری مسجد میں آؤ اذان کی آواز سنو، قبلہ کی طرف منہ کر کے سجدہ میں گر جاؤ تاکہ یہ سوزش دفع ہو۔" ایک راہب کہن سال نمودار ہوتا ہے اور تلقین کرتا ہے "میرے عالی شان کلیسا میں آؤ، گھنٹہ کی صدا پر متوجہ ہو، پیمبر مصلوب کی شبیہ سے التجا کرو تاکہ یہ بیچینی دور ہو۔" جاتریوں کا گروہ جق در جق مندروں سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن ان کے قشقہ کا صندل بھی خشک نہیں ہو چکتا کہ ان کے سر جنگ و جدل سے رنگین نظر آنے لگتے ہیں۔ جماعت کی جماعت مسجدوں سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر ان کی پیشانی سے سجدہ کا نشان خاک بھی محو نہیں ہو چکتا کہ ایک دوسرے پر کثافت اُچھالتا ہوا نظر آتا ہے۔ گروہ کا گروہ کلیسا سے باہر آتا ہے اور ابھی عود و عنبر کے بخور کی خوشبو بھی ان کے لباس سے جدا نہیں ہوتی کہ معصیت کی پرعفونت آغوش ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

ایک رندِ لاابالی، ایک مردِ دلیدہ مو، جو نہ کبھی کسی مندر میں گیا، نہ مسجد میں، نہ جس نے کبھی دیر میں سر جھکایا، نہ کلیسا میں، انسان کی اس بیچارگی کا مطالعہ کرتا ہے اور اس قوت کے سامنے جس کو اس نے ہمیشہ تمام علایق مذاہب و مسالک سے بے نیاز ہو کر پہچانا، متحیرانہ و مستفسرانہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ آسمان کا ایک ستارہ ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا اس کی آغوش میں گر جاتا ہے اور یہ اُسے سینے سے لگائے اپنی راہ لے لیتا ہے۔ صبح کو قدوسیوں کی جماعت اس کو فاک بسر و چاک گریباں دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہے کہ یہ کوئی شرابی ہے۔ یقیناً وہ شرابی ہے وہ مست ہے لیکن ایسا کہ:۔

مستیش را نبود نغمہ و صہبا سامان

دوسرا گروہ آتا ہے، کہتا ہے کہ یہ تو فاسق و فاجر ہے، ملحد و بیدین ہے، بے شک وہ ایسا ہی ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ:۔

نازد بہ کفر خود کہ بہ ایماں برابرست

اس کے مجروح جسم، اس کے داغدار سر و سینہ کو دیکھ کر لوگ نفرت کرتے ہیں اور جس وقت وہ بیتاب ہو کر چیخ اُٹھتا ہے کہ:۔

در دلبست در دلم کہ بدرماں برابرست

تو اس کا سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔

دُنیا میں کوئی چیز بذات خود نہ بُری ہے نہ اچھی۔ اس سے اچھائی یا بُرائی کا خلق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ان کا استعمال کیا جائے پھر اگر اس سے خیر و فلاح کا کام لیا جاتا ہے تو اس کی تعریف کی جاتی ہے، ورنہ نہیں۔ زنگ خوردہ لوہے کا ٹکڑا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن اگر اسی سے زخم پہونچایا جانے لگے تو لوگ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے، تیغ و تفنگ اپنی جگہ بے حقیقت چیزیں ہیں۔ لیکن ان کے استعمال کی تاریخ اس قدر خونیں ہے کہ لوگ اس کو دیکھتے ہی خائف ہو جاتے ہیں۔ درآنحالیکہ اگر ان سے انسان کا خون نہ بہایا جاتا، تو آج لوگوں کو یہ یقین کرنے میں بھی تامل ہوتا کہ بندوق کی گولی انسانی سینہ کے اندر داخل ہو سکتی ہے اور تلوار کی دھار انسان کے اعضاء کو قطع کر سکتی ہے۔ بالکل یہی حالت دُنیا کی اور تمام تحریکوں کی ہے جن کو اصلاح نوع انسانی اور قیام امن و سکون کے لئے بروئے کار لایا گیا پھر جب تک ان سے مقصد اصلاح پورا ہوتا رہا لوگ متوجہ ہوتے رہے اور جب ان کی حقیقی روح مفقود ہو گئی تو لوگوں نے ان سے روگردانی اختیار کر لی اور وہ مردہ ہو کر رہ گئیں۔

میٹرک باٹ
لازمی

یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء سے ذیل کے علاقوں میں، سبھی لین دین میں، میٹرک باٹوں کا استعمال لازمی ہوگیا ہے۔ تمام تجارتی میٹرک باٹوں پر محکمہ ناپ تول کے حکام کی مُہر ہونا ضروری ہے۔ دوسرے، بغیر مُہر والے باٹوں کا استعمال غیر قانونی ہوگا۔

آندھرا پردیش : ویشاکھاپٹنم، کرشنا گنٹور، کرنول، حیدرآباد، وارنگل اور نظام آباد کے اضلاع اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔
آسام : ضلع نوگاؤں اور گوہاٹی شہر۔
بہار : بھاگلپور و رانچی ڈویژنوں اور پٹنہ و تِرہُت ڈویژنوں کے میونسپل اور نوٹیفائڈ علاقے۔
گجرات : احمدآباد، راج کوٹ، بڑودہ کے شہر اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔
کیرالا : کوزی کوڈ، ارناکلم اور کولم کے اضلاع۔
مدھیہ پردیش : سہور، اندور، گوالیار اور جبل پور کے اضلاع اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔
مدراس : مدراس، چنگل پٹ، جنوبی ارکاٹ، شمالی ارکاٹ کے اضلاع اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔
مہاراشٹر : بمبئی، پونا، ناگپور، اورنگ آباد، شولاپور، کولہاپور، اکولہ، امراوتی، واردھا، یوت ماں کے شہر اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں
میسور : بنگلور، رائچور، دھارواڑ کے اضلاع اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔
اُڑیسہ : برہم پور، کٹک اور سمبل پور کے شہر۔
پنجاب : امرت سر، جالندھر، لدھیانہ، انبالہ، پٹیالہ، اور گوڑگاؤں کے اضلاع اور ریاست کی تمام باضابطہ منڈیاں۔
راجستھان : اجمیر، بیکانیر، جودھپور، جے پور، کوٹہ اور اودے پور کے اضلاع۔
اُتر پردیش : میرٹھ، آگرہ، لکھنؤ، بریلی، مرادآباد، وارانسی، کان پور، جھانسی، الہ آباد اور گورکھپور کے شہر۔
مغربی بنگال : کلکتہ اور ہوڑہ کے میونسپل علاقے۔
دہلی : دہلی کا سارا علاقہ۔
ہماچل پردیش : منڈی اور سرمور کے اضلاع۔
منی پور : امپھل شہر۔
تری پورہ : اگرتلہ شہر۔
جزائر انڈیمان و نکوبار : پورٹ بلیر شہر۔
پانڈی چری : پانڈی چری کا سارا علاقہ۔

ذیل کی صنعتوں اور کاروباروں میں سبھی لین دین میں میٹرک باٹوں اور پیمانوں کا استعمال لازمی ہوگیا ہے۔
پٹ سن، سوتی کپڑے، لوہا و فولاد، انجینیری ساز و سامان، بھاری رسائن، سیمنٹ، نمک، کاغذ، ریفریکٹریز، غیر آہن آمیز دھاتوں اور ربڑ کی صنعتوں، دناسپتی، صابن سازی، اونی چیزیں تیار کرنے کی صنعت، کپاس کے وعدہ بازار کے کنٹرولوں میں اور کافی بورڈ کے لین دین میں۔

میٹرک نظام
آسانی و یکسانی کے لئے
جاری کردہ بھارت سرکار

ماتمِ جگرؔ

(مسعود اختر جمالؔ)

ایک یکتائے فن کا ماتم ہے
تا جسدارِ سخن کا ماتم ہے

طرحدارانِ حُسن کی صف میں
عشق کے بانکپن کا ماتم ہے

ماہ پاروں میں، گلعذاروں میں
کجکلاہِ چمن کا ماتم ہے

حشر برپا ہے بزمِ رنداں میں
ساقیِ انجمن کا ماتم ہے

جاں نثاروں میں سرفروشوں میں
ایک زنداں شکن کا ماتم ہے

سرنگوں ہے نشانِ پرویزی
عظمتِ کوہکن کا ماتم ہے

ایک دُرِّ عدن ہوا رخصت
ایک لعلِ یمن کا ماتم ہے

سوز و سازِ عرب گدازِ عجم
دل نوازِ سخن کا ماتم ہے

نازشِ موجِ زمزم و کوثر
فخرِ گنگ و جمن کا ماتم ہے

حُسنِ تقدیسِ شیخ کا رونا
حرمتِ برہمن کا ماتم ہے

آج شعلہ نفس ہیں پروانے
شمعِ بزمِ وطن کا ماتم ہے

اے چمن تیرا غمگسار گیا
"آتشِ گل" کا رازدار گیا

دلکشی گم ہوئی بہاروں سے
روشنی چھن گئی ستاروں سے

کیا قیامت گزر گئی دل پر
کچھ نہ پوچھو الم گساروں سے

دردِ محفل کا ترجماں نہ رہا
زندگی کا فسانہ خواں نہ رہا

وہ کہ جس کے لئے ہیں خاک بسر،
اہلِ دل، اہلِ ذوق، اہلِ نظر

طے کیا جس نے بے نیازانہ
خارزاروں میں زندگی کا سفر

رزمگاہِ حیات میں تنہا
حق کی خاطر رہا جو سینہ سپر

جس کے ہر نقشِ پا سے اُبھرے ہیں
صد ہزاراں ہزار شمس و قمر

سینۂ داغ داغ سے جس کے
دامنِ شب ہوا ہے رشکِ سحر

جس کے اندازِ والہانہ سے
بزمِ اربابِ ہوش زیر و زبر

جس کے آئینۂ تخیل سے
منعکس آب و تاب لعل و گہر

آگئی نیند اُس مسافر کو
جس سے بیدار تھا ضمیرِ بشر

سوگیا وہ کہ جس کے قدموں سے
جاگتی تھی ہر ایک راہ گزر

جس سے پُرنور تھا جہانِ وفا،
بجھ گیا وہ چراغِ علم و ہنر

آہ بیدرد موت کے ہاتھوں
زہر میں یہ بجھا ہوا نشتر

ہاں تڑپ اے دلِ نزار تڑپ
خون رو خون۔ آج دیدۂ تر

قلبِ نظارگاں دونیم ہوا
"شعلۂ طور" بے کلیم ہوا

جگر میری نظر میں

(شہاب سرمدی)

یارو نہ رہا! بلبلِ بستانِ تغزل
شاید کششِ حسن کو بے چین سمجھ کر
تیاگے ہوئے گو کنول تو بہت روز ہوئے تھے
چپ ہو گیا وہ رمز شناسِ مے و مینا
غم جس کو ملا وسعتِ کونین پہ بھاری
جوں شمع بجھا انجمن افروز جوانی
وہ روحِ چمن ہم نفسِ نکہتِ گلشن
وہ حاجبِ ایوانگہِ اسرار و معانی
وہ سرخوش و سرشار و پرستارِ محبت
وہ رندِ خراباتیِ و مستِ مے صافی،
اک "برق" چمک جائے جو "ساغر" کو اٹھالے
اللہ ری سرگشتگیِ شوق کی عصمت
مائل بہ طہارت جو ہوا نشۂ توبہ
دل وادیِ سینا تو نظر طورِ تجلی،
تیور میں قلندر کے کوئی فرق نہ آیا
سجدہ جو کیا مسجد و محراب بھی جھومے
اسرار میں ڈوبا کبھی انوار میں ابھرا
چمکی ہوئی مستی وہ دمکتا ہوا چہرہ
فرزانگیِ فکر ہے تابندہ نگاہیں
اٹکا سرِ مسند تو کھٹکنے لگی محفل
ہر لفظ کو اک اور ہی آواز عطا کی،
شیرینیِ کوثر سے ہے سنجوگ ملا ہے
وہ لحنِ جلی، صوتِ حسن، سحرِ ترنم
وہ نزہتِ تخئیل سبک لمس کہ جس نے
آہنگِ تراکیب پہ شیرازۂ فرحت
پردوں پہ حکایات کے نغمات کی بارش
یارو نہ رہا قصرِ ایوانِ تغزل
وہ دے کے گیا حسرت و اصغر کا تتمہ
الحمد لمن قدر خیراً و غبالا

اک "دل" نہیں اک "دور" ہوا ہے تہ و بالا
منزل کی طرف چل ہی پڑا "چاہنے والا"
متھرا بھی سنا چھوڑ گیا بانسری والا
جس نے سرِ خمخانۂ دل ہوش سنبھالا
دل جس کو ملا ایک تپکتا ہوا چھالا،
لیتی رہی امید سنبھالے پہ سنبھالا
وہ ہم اثرِ جوشِ بہار گل و لالہ
انوار سے "تاحد ادب" کھیلنے والا
گیتوں میں سدا جس نے جپی حسن کی مالا
بھر دے جو فضاؤں کے اندھیرے میں اُجالا
باران تجلی ہو ٹپک دے جو پیالہ
اک دامنِ تر بن گیا جنت کا شوالہ
ہر سانس کو موجِ مئے عرفاں میں کھنگالا
سینے میں سلگتی ہوئی تخلیق کی جوالہ
کاندھے پہ وہ کملی ہو کہ زرکار دوشالہ
جھومے تو لگا سیس نوائے ہے شوالہ
زد میں کبھی طوبیٰ، تو کبھی طارمِ اعلیٰ
جیسے کہ چڑھے چاند پڑے چاند میں ہالا
چتون میں جھلکتا ہوا تن من کا اُجالا
جی کھول کے جو رنگ بھی چاہا وہ اُچھالا
آواز کو اک نغمۂ بیدار میں ڈھالا
مدت میں پڑا بارِ بدِ وقت سے پالا
داؤد کا دیں جیسے مزامیر حوالہ
خوشبوئے مجسم کو گل تر سے نکالا
مستی مضامین پہ جھومے ندۂ شالہ
رہ رہ کے بجے جیسے کسی ساز کا جھالا
یارو نہ رہا ہم میں وہ ہم سب سے نرالا
ہے اور سرافراز غزل کا قدِ بالا
والشکر لمن صور حسنا وجمالا

(شفقت کاظمی)

راہ دیکھا کئے عمر بھر آپ کی — کوئی لایا نہ ہم تک خبر آپ کی
جب سے اہلِ جنوں کا ٹھکانا بنی — کتنی آباد ہے رہگذر آپ کی
بے تعلق رہے آپ ہم سے مگر — یاد آتی رہی بیشتر آپ کی
یوں میں ہر راہ پر گام فرسا رہا — جیسے ہر راہ تھی رہگذر آپ کی

کتنے افسانے اُس کے بنے کاظمی
بات ہر چند تھی مختصر آپ کی

حسرت یہی دل میں لے چلے ہم — تجھ کو نہ لگا سکے گلے ہم
نکلے ہیں وطن سے منہ اندھیرے — معلوم نہیں کہاں چلے ہم
کیا کیا دلِ زار تھا پر اُمید — جب منزلِ دوست کو چلے ہم

شفقت یہ ہجومِ یاس و حرماں
دیکھا کئے دل کے حوصلے ہم

فوری آرام اور تسکین کے لئے

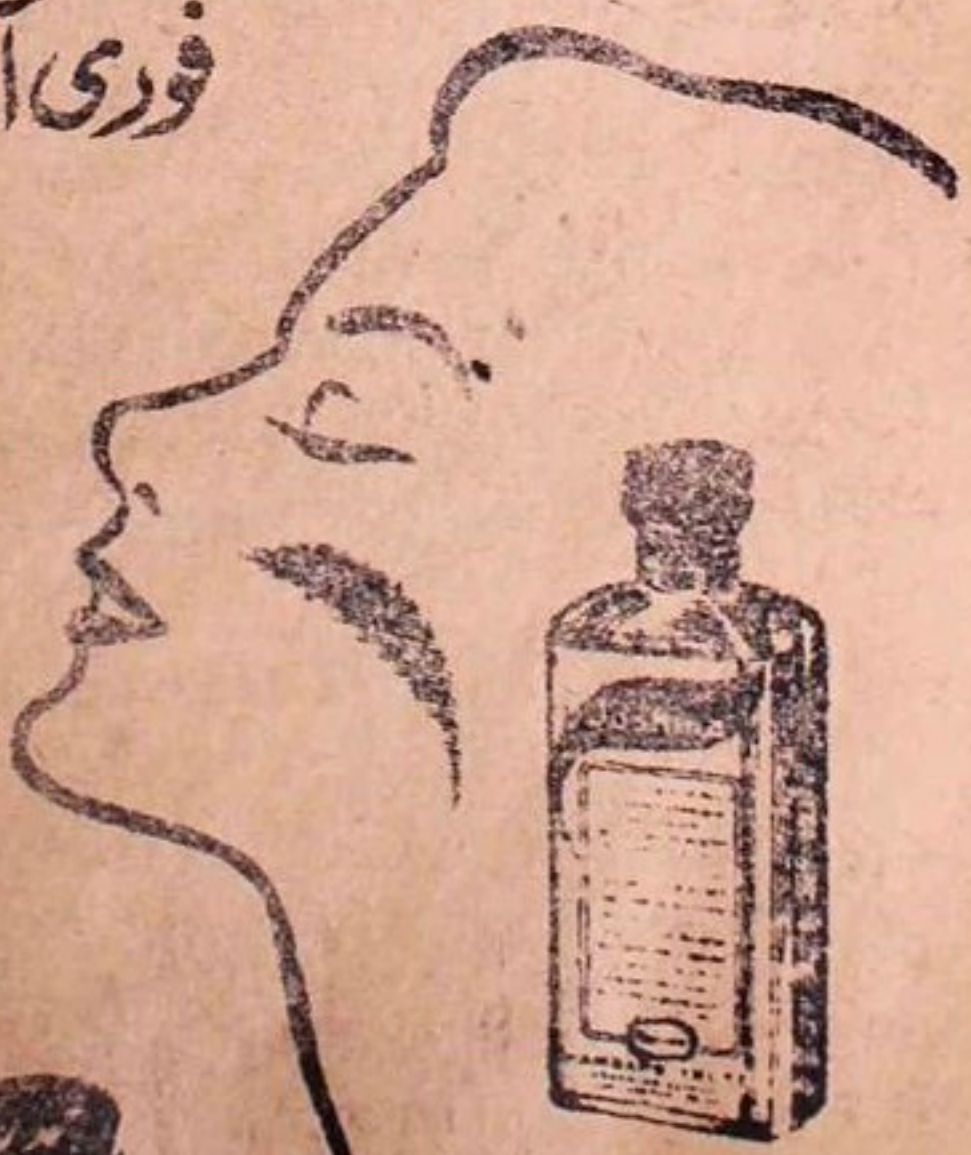

جوشیندا

طب یونانی کے مشہور نسخہ جوشاندہ کا ایکسٹریکٹ
جوشیندا زکام کا مکمل علاج ہے۔ یہ سانس
کی نالیوں کو کھولتا ہے۔ کھانسی، چھینکوں اور حرارت
کو روکتا ہے اور تسکین بخشتا ہے۔
ہمیشہ ایک شیشی اپنے پاس رکھیں۔

ہمدرد دواخانہ (وقف)
دہلی۔ کانپور۔ پٹنہ

ہمدرد

مطبوعات موصولہ

یورپ نامہ حصۂ اول سفر نامہ ہے جناب حکیم محمد سعید دہلوی کا، جس میں انھوں نے ان تمام تاثرات کو قلمبند کیا ہے جو ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کی سیاحت کے بعد وہ اپنے ساتھ لائے۔

حکیم صاحب کی اس سیاحت کا مقصد ممالک یوروپ کے فن دوا سازی، طریق علاج اور طبی اختراعات کا مطالعہ کرنا تھا، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے ہر ملک کی ثقافتی، ادبی و تعلیمی زندگی کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا اور اس طرح یہ سیاحت نامہ اپنے مقصد کے لحاظ سے بڑی وسیع چیز ہوگیا اور ۵۰۰ صفحات کی ایک بڑی دلچسپ معلوماتی تصنیف بن گیا۔

ہمدرد دواخانہ نے ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ غیر معمولی ترقی کی ہے اس کا راز جذبۂ تجارت نہیں بلکہ فن طب کی ترقی کا جذبہ ہے اور یہی لگن ان دونوں بھائیوں کو غیر ممالک لے گئی، جہاں انھوں نے ترقی یافتہ دواسازی کے فن کا مطالعہ کرکے ہمدرد دواخانہ کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

یہ دلچسپ سیاحت نامہ جس میں متعدد رنگین تصاویر بھی شامل ہیں۔ آٹھ روپیہ میں ہمدرد اکاڈیمی - نیو ٹاؤن، کراچی سے مل سکتا ہے۔

History of the Freedom movement Vol II

اس موضوع پر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کی یہ دوسری جلد ہے جو بارہ ابواب پر منقسم ہے:- (۱) عہد مغلیہ کا آخری دور۔ (۲) افغانستان و مفاد برطانیہ۔ (۳) سقوط سندھ۔ (۴) سکھ حکومت کا اختتام۔ (۵) کشمیر کا سودا۔ (۶) اودھ میں مسلم حکومت کا خاتمہ۔ (۷) سید احمد شہید کے جانشین اور جہاد سرحد۔ (۸) مسلم طریق تعلیم مغل کے دوسرے دور حکومت میں۔ (۹) برطانیہ کی تعلیمی پالیسی۔ (۱۰) جنگ آزادی کے اسباب۔ (۱۱-۱۲) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں۔

یہ ابواب مختلف اکابر علم و ادب نے لکھے ہیں اور ہر مقالہ نگار نے نہایت خوبی کے ساتھ پوری تاریخ کو جو ۱۷۰۷ء سے لیکر ۱۹۰۵ء کے حالات پر مشتمل ہے، چند صفحات میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس کی دو جلدیں اور زیر تالیف ہیں، جسکی اشاعت کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

اس میں شک نہیں یہ سوسائٹی بڑی گرانقدر علمی و تاریخی خدمت انجام دے رہی ہے اور اس سے دنیائے علم و ادب کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

یہ جلد بڑے سایز کے ۳۳۲ صفحات کو محیط ہے اور طباعت و کاغذ وغیرہ کے لحاظ سے قدر اول کی چیز۔ قیمت درج نہیں ہے۔

مقدمۂ کلام آتش مجموعہ ہے آتش کے متعلق جناب خلیل الرحمان اعظمی کے چند مقالات کا جن میں سے بعض نگار میں بھی شایع ہو چکے ہیں۔ لکھنؤ اسکول کا وہ دور جو عہد آتش و ناسخ سے تعلق رکھتا ہے، بڑے معرکہ کا دور تھا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ جس انداز کی غزل گوئی کا مارا ہوا تھا، وہ زیادہ تر ناسخ کی ایجاد تھی، لیکن اس کا بدرقہ اگر کوئی تھا تو آتش کا انداز سخن جسے لوگوں نے کم پہچانا۔ اور جناب اعظمی کا مقصود ان مقالات سے یہی ہے کہ لوگ آتش کو پہچانیں۔

آتش بڑا شاعر نہ ہو لیکن مقابلتاً وہ ناسخ سے کہیں زیادہ اچھا شاعر تھا اور اعظمی صاحب نے اسی حقیقت کو نہایت وضاحت کے ساتھ واشگاف کیا ہے۔

یہ مجموعہ ۱۲ر میں انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ سے مل سکتا ہے۔

مراثی انیس میں ڈرامائی عنصر

جناب شارب ردولوی (ام۔اے) کی تصنیف ہے اور موضوع نام سے ظاہر ہے۔ فاضل مولف نے سب سے پہلے ڈرامہ و مرثیہ کی ابتدا اور اس کی تدریجی ترقی پر گفتگو کی ہے جو بجائے خود بڑی مفید و دلچسپ بحث ہے اور اس کے بعد مراثی انیس کو سامنے رکھ کر اس کے ڈرامائی عناصر پر اظہار خیال کیا ہے اور اس سلسلہ میں کافی تحقیق سے کام لیا ہے۔

ضخامت ۱۴۸ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔ ناشر: نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

حرفِ جنوں

جناب بشیر فاروقی کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے جسے مکتبۂ ماحول بہادر شاہ مارکٹ کراچی نے حال ہی میں شایع کیا ہے۔

بشیر فاروقی، کراچی کے بڑے پرجوش شاعر ہیں، نہ صرف اسلئے کہ قلیل عرصہ میں تابڑ توڑ ان کے دو دیوان شایع ہو گئے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ شعر و سخن سے بڑا والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔

ابتدا میں جناب رئیس لاہوری نے ایک بسیط مقدمہ لکھ کر جناب بشیر فاروقی کی خصوصیات شاعری کی وضاحت کی ہے اور اس کے بعد بشیر فاروقی صاحب نے اپنا نقطۂ نظر غزل کے باب میں پیش کیا ہے۔

اس مجموعہ میں غزلیں زیادہ ہیں اور نظمیں کم، لیکن ان دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا مستقبل شاندار ہے۔

شام و شفق

مجموعہ ہے ڈاکٹر سلام سندیلوی کی تلمیحی رباعیوں کا۔ اس میں ملکی و غیر ملکی روایات کی تمام مشہور تلمیحات پائی جاتی ہیں اور نہایت خوبی سے ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

فٹ نوٹ میں روایات کو بھی درج کر دیا گیا ہے تاکہ مفہوم سمجھنے میں آسانی ہو۔ رباعی نگاری میں یہ جدت قابل داد ہے

قیمت دو روپیہ۔ ناشر۔ نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

کچھ ذرّے کچھ تارے

مجموعہ ہے جناب انند نرائن ملا کی نظموں اور غزلوں کا جسے انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔

جناب ملا کی خصوصیات شاعری سے دُنیائے شعر و ادب پوری طرح واقف ہے، ان کی شاعری بڑی جاندار، روح پرور اور سبق آموز ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کا فن یکسر "ادب برائے زندگی" سے تعلق رکھتا ہے، لیکن انداز بیان، اسلوب ادا، ندرت خیال و جدت تعبیر کے لحاظ سے اس کا پس منظر وہی کلاسکل تغزل ہے جو غم جاناں کے لئے کسی وقت مخصوص تھا، اور غالباً اب بھی ہے۔

عہد حاضر کے شعراء میں ملا کو اپنے مخصوص آہنگ کے لحاظ سے جو امتیاز حاصل ہے، اس میں کوئی دوسرا شاعر ان کا شریک و سہیم نہیں۔ قیمت عہ۔

حالی کا سیاسی شعور

معین احسن جذبی کی تصنیف ہے، جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ حالی کی سیاست محض سرسید کی تقلیدی سیاست نہ تھی بلکہ وہ اپنی جگہ ایک ایسا مکتبۂ خیال تھا جس کی تعمیر خود ان کے ذاتی مطالعہ اور عوامل ماحول کا نتیجہ تھی۔

جناب جذبی یہ مقالہ لکھ کر حالی کو اس سطح پر لے آئے ہیں، جس کا علم بہت کم لوگوں کو تھا۔

جناب جذبی نے جو کچھ لکھا ہے وہ نتیجہ ہے خود کلام حالی کے مطالعہ کا اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے بالکل پہلی بار بالکل نئے رُخ سے حالی کی تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے اور یہ تصویر تمام دوسری تصویروں سے زیادہ شاندار، خوبصورت اور حقیقی ہے۔

قیمت چار روپیہ آٹھ آنے۔ سول ایجنٹ: انجمن ترقی اُردو ہند علی گڈھ۔

فکرِ غالب تالیف ہے جناب پرتھوی چندر کی جس میں انھوں نے غالب کے تمام حالات و اخلاق کو قلمبند کرکے ان کی شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے اور انتخاب کلام بھی دیدیا ہے، ایک نئی بات انھوں نے یہ بھی کی ہے کہ غالب کے بعض نقادوں اور شارحین کے بیانات کو لے کر ان پر بھی رائے زنی کی ہے۔

بہرحال یہ کتاب غالب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بہت مفید ہے۔ قیمت ہے۔ ملنے کا پتہ: نیو تاج آفس اُردو بازار۔ دہلی

اُجلی پرچھائیاں مجموعہ ہے جناب اقبال متین کے افسانوں کا جسے مکتبۂ صبا حیدر آباد نے شایع کیا ہے۔ افسانے دلچسپ ہیں اور اسلوب بیان دلکش۔ قیمت چار روپیہ آٹھ آنے۔

نہایت ضروری اعلان

آیندہ مردُم شماری میں اپنی زبان اُردو درج کرائیے، ہندوستانی نہیں

فروری ۱۹۶۱ء میں پورے ہندوستان کی مردُم شماری ہونے والی ہے۔ اس موقع پر ہر شخص کی معاشی، مذہبی و ثقافتی حالات دریافت کئے جائیں گے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ:-

"اس کی مادری و ثانوی زبان کیا ہے"

اس لئے خواہ آپ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا سکھ، آپ کا فرض ہے کہ اگر آپ اپنے گھروں میں، اپنے کاروبار میں، اُردو سے کام لیتے ہیں تو

نقشۂ مردُم شماری میں اُردو اور صرف اُردو درج کرائیے

ہوسکتا ہے کہ آپ سے کہا جائے کہ ہندوستانی بھی اُردو ہی ہے اس لئے ہندوستانی لکھائیے، لیکن آپ کبھی اس دھوکے میں نہ آیئے، کیونکہ آئین کی منظور شدہ ۱۴ زبانوں میں ہندوستانی کا ذکر کہیں نہیں ہے۔

اس سے پہلے ۱۹۵۱ء کی مردُم شماری میں لوگوں نے غلطی سے اُردو کی جگہ ہندوستانی درج کرادی اور اس سے اُردو کو سخت نقصان پہونچا۔ یوپی۔ دلی۔ بہار وغیرہ میں جہاں اُردو مادری زبان ہے وہاں کے لوگوں کو اُردو ہی درج کرانا چاہئے، لیکن پنجاب و بنگال و اڑیسہ وغیرہ میں جہاں کی زبان اُردو نہیں ہے، وہاں ثانوی زبان کی حیثیت سے اُردو درج کرانا چاہئے۔

یاد رکھئے کہ اُردو کی تحفظ کا یہ سب سے زیادہ موثر عملی طریقہ ہے اور اگر اس کو نظر انداز کر دیا گیا تو پھر اُردو کی تباہی کے ذمہ دار آپ ہی ہوں گے۔

(نیاز)

ڈالڈا پر بات چیت

ہم اپنا کھانا پکاتے کیوں ہیں؟

ماہر غذا:۔ ہم اپنا کھانا پکانے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ — اسکی بہت سی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہی کہ پکانے سے عموماً کھانے کی شکل و صورت بہتر ہو جاتی ہے۔ اور ایک یہ بھی کہ اسمیں نئے ذائقے آجاتے ہیں۔ کچھ جانور بھی، موقعہ پانے پر پکے ہوئے کھانے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

آپ:۔ تو کیا اسی لئے ہم اپنا کھانا پکاتے ہیں؟

ماہر غذا:۔ پکے ہوئے کھانے کی زیادہ اہمیت اسلئے ہے کہ کھانے کے دوران میں قوت ہضم کے عرق اسکے باعث زیادہ تیزی سے کام کرتے ہیں۔ اور پکانے سے بہت سے جراثیم اور طفیلی کیڑے بھی اپنے انجام کو پہنچتے ہیں اور پکا کھانا محفوظ تر ہو جاتا ہے۔

آپ:۔ مگر اسطرح ہمارے کھانے کی چیزوں کی بہت سی خوبیاں کیا برباد نہیں ہو جاتیں؟

ماہر غذا:۔ جی نہیں، بلکہ پکانا تو لوگ بھگ ہر طرح کے گوشت، سبزیوں اور دالوں کیلئے مفید ہے — چاہے فقط اسی لئے ہی کہ پکانے سے کھانا زود ہضم ہو جاتا ہے۔

آپ:۔ وہ کیسے؟

ماہر غذا:۔ اب مثال کیلئے سبزیاں لیجئے۔ کچی سبزیوں میں ناقابل ہضم فشاستہ اور ریشے کے حصے ہوتے ہیں جو پکانے سے نرم ہو کر بآسانی قابل ہضم ہو جاتے ہیں۔ پھل جب پکتے ہیں تو اُن میں بھگ بھگ ایسا ہی عمل ہوتا ہے۔ اسلئے سبزیوں کو پکانا درحقیقت قدرت ہی کے اصولوں کی نقل کرنا ہے۔

آپ:۔ لیکن پکانے سے سبزیوں کے کچھ قیمتی اجزا یقیناً برباد بھی ہو جاتے ہیں۔

ماہر غذا:۔ ہاں، پکانے سے سبزیوں کے کچھ وٹامن اور معدنیات ضائع ہو جاتی ہیں لیکن یہ مجبوری ہے۔ اسکے برعکس پکانے کا یہ فائدہ بھی ہے کہ کھانے کے ہضم کا عمل پکانے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے، اور یوں آپکے نظام ہضم پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا۔

آپ:۔ تو کیا ہم گوشت کو اسی لئے پکاتے ہیں؟

ماہر غذا:۔ ہاں زیادہ تر تو اسی لئے۔ حرارت سے گوشت کی پروٹینز نرم ہو جاتی ہیں اور یہ آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے۔ گوشت اگر تازہ ہو یا حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق رکھا جائے تو اسمیں خطرناک جراثیم چھپے ہو سکتے ہیں جنسے چھٹکارا پانے کیلئے گوشت کو پکانا ضروری ہے۔ پکانے سے گوشت کے ذائقہ بخش اجزا بھی اُبھر آتے ہیں اور گوشت زیادہ مزیدار بنتا ہے۔

ہم:۔ یہ تو خیر سب ٹھیک ہے مگر کئی بار پکانے سے کھانے کی چیز کا ذائقہ جاتا رہتا ہے...

ماہر غذا:۔ بیشک۔ کیونکہ بہت کچھ آپکے کھانا پکانے کے طریقے پر منحصر ہوتا ہے۔ کھانے کے ذائقے کو بنانا یا بگاڑنا آپکے کھانا پکانے کے طریقے ہی میں نہاں ہے۔

آپ:۔ ہاں، یہ تو معلوم ہے۔

ہم:۔ لیکن کھانے کا ذائقہ اگر ویسا نہیں جیسا کہ ہونا چاہیئے — اور کھانے کا لطف ذائقہ اگر برقرار نہیں رہتا تو یہ فقط کھانا پکانے کے طریقے ہی کے باعث نہیں اُس چیز کے بھی باعث ہے جس میں کھانا پکایا جاتا ہے۔

آپ:۔ کیا مطلب؟ جس میں کھانا پکایا جاتا ہے!

ہم:۔ دیکھئے نا، کھانا پکانے کی جو چکنائی آپ استعمال کرتے ہیں وہ بہت اہم ہے۔ پکانے کی چکنائیوں اور تیلوں میں سے چند ایک، کھانے پر اپنا ذائقہ سوار کر دیتے ہیں۔ لیکن کچھ چکنائیاں، کھانوں کے قدرتی ذائقے کو اُبھارنے میں مدد کرتی ہیں جیسے کہ ڈالڈا ونا سپتی۔

آپ:۔ ڈالڈا ونا سپتی بھلا یہ کیسے کرتا ہے؟

ہم:۔ اول تو یہی کہ ڈالڈا ایک ایسی چکنائی ہے جسمیں نہ تو اپنا ذائقہ ہے نہ مہک۔ اسلئے یہ اپنی طرف سے کھانے میں کسی ذائقہ یا مہک کا اضافہ نہیں کرتا۔

آپ:۔ اچھا؟

ہم:۔ ڈالڈا کو اعلیٰ درجے کا خالص بنانے کیلئے مشینوں کے ذریعے دو بار صاف کیا جاتا ہے۔ یہ کھانوں کے ہلکے پھلکے ذائقوں کو بھی باہر لے آتا ہے۔ اپنی طرف سے یہ آپکی غذا میں فقط قوت اور غذائیت کا اضافہ کرتا ہے۔

آپ:۔ یہ قوت بخش کیونکر ہے؟

ہم:۔ اسکے ہر اونس میں وٹامن اے کے سات سو اور وٹامن ڈی کے ۵۰ میں الاقوامی یونٹس پائے جاتے ہیں۔ جلد، ہڈیوں، آنکھوں اور دانتوں کی حفاظت کرنے اور انہیں صحت بخشنے میں یہی وٹامن مددگار ہوتے ہیں۔ اور ڈالڈا، آپکو حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق تیار کردہ ڈبوں میں ملتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈالڈا کی سبھی خوبیاں آپ کیلئے محفوظ ہیں...

آپ:۔ پھر تو ہم نے اپنے لئے کھانا پکانے کی صحیح چکنائی ہی چن رکھی ہے۔ ہم تو سبھی کچھ ڈالڈا ہی میں پکاتے ہیں — اور سچ پوچھئے تو پچھلے بیس برس سے پکاتے آرہے ہیں۔

ہم:۔ روز بروز زیادہ سے زیادہ لوگ ڈالڈا ونا سپتی استعمال کر رہے ہیں، اور کیوں؟ — اسکا جواب تو اب آپ جانتے ہی ہیں!

ہندستان لیور نے بنایا